جائیداد کا وارث

احمد یار خان



جائیداد کا وارث

مشرقی پنجاب کا وہ قصبہ تحصیل ہیڈ کوارٹر تھا جس کے تھانے میں میری تعیناتی کو تقریباً ڈیڑھ سال ہو گیا تھا۔ جرائم کے لحاظ سے قصبہ تو پُرسکون تھا لیکن اس کے تھانے کے تحت جو علاقہ تھا وہ سب دیہاتی تھا۔ زیادہ تر گاؤں سکھوں کے تھے جو پولیس کے لئے مسلسل دردِ سر بنے رہتے تھے۔ ڈکیتی عام پیشہ تھا۔ اس علاقے نے ایسے ڈاکو پیدا کئے ہیں جنہیں وہاں کے لوگ آج بھی نہیں بھولے ہوں گے۔ قتل کی وارداتیں بھی کم نہیں ہوتی تھیں۔ یہ سکھوں کی ہابی تھی۔ میں اس تھانے میں دو سال رہا تھا۔ حالت یہ تھی کہ چوبیس گھنٹوں میں ایک منٹ بھی چین اور آرام کا نہیں ملتا تھا۔ البتہ ایک سہولت میسر تھی۔ قتل کی زیادہ تر وارداتوں میں تفتیش تو ہوتی ہی تھی لیکن سراغرسانی کی بہت کم ضرورت پڑتی تھی۔ وہ اس لئے کہ سکھ قتل کر کے چھپاتے نہیں تھے۔ کوئی کوئی قتل ایسا ہوتا تھا جس میں قاتل اپنا نشان یا سراغ نہیں چھوڑتا تھا۔ ایسے پُراسرار قتل میں ویسی ہی سراغرسانی کرنی پڑتی تھی جو میں آپ کو سناتا رہتا ہوں۔

میں اس تھانے میں آیا تو دوسرے ہی روز قتل کی ایک واردات ہو گئی۔ مقتول کو چھری سے قتل کیا گیا تھا۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر قاتل پکڑا گیا۔ تین آدمیوں نے اس پر شک کا اظہار کیا تھا۔ میں نے اُسے شاملِ تفتیش کر کے پوچھا کہ یہ قتل اُس نے کیا ہے؟

”آہو، مَیں کیتا اے“ — اُس نے بڑے رُعب سے جواب دیا — ”تُوں ایدا پیو لگنا ایں؟“

(ہاں، میں نے کیا ہے۔ تم اس کے باپ لگتے ہو؟)

میں نے وجہ پوچھی۔

"میری تیویں نوں ایداں اڑا ئی پھر دا سی جیویں اے میری نہیں ایدے پیے دی تیویں اے"۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔

(میری بیوی کو اس نے یوں پھانس رکھا تھا جیسے یہ میری نہیں اس کے باپ کی بیوی ہو۔)

میں نے اُس کے ساتھ یہ رعایت کی کہ قتل کا باعث فوری اشتعال رکھا اور ثابت بھی کرا دیا۔ اُسے سزائے موت یا عمر قید کی بجائے صرف پانچ سال سزائے قید ملی جو اپیل میں ہائی کورٹ نے تین سال کر دی۔

ایسی ہی اور کئی دل چسپ وارداتیں ہوتی تھیں جو پھر کبھی سناؤں گا۔ دراصل وارداتیں دلچسپ نہیں تھیں، وارداتیں کرنے والے دلچسپ تھے۔ ابھی میں آپ کو قتل کی ایک واردات کی تفتیش سُنا رہا ہوں۔ یہ واردات مسلمانوں کی تھی۔ مشرقی پنجاب ہمیشہ سکھوں کا علاقہ رہا ہے۔ کچھ علاقے مثلاً فیروز پور، گورداسپور وغیرہ مسلمانوں کی اکثریت کے علاقے تھے۔ یہ پاکستان میں آنے والے علاقے تھے لیکن انگریزوں نے ہندو نوازی کا یہ مظاہرہ کیا کہ یہ علاقے بھی بھارت میں شامل کر دیئے۔

میرے تھانے کے علاقے میں اکثریت سکھوں کی تھی۔ ان میں تین گاؤں مسلمانوں کی اکثریت کے تھے۔ ان میں کچھ آبادی سکھوں کی بھی تھی۔ ان تین گاؤوں میں ایک گاؤں خاصا بڑا تھا۔ مسلمان زراعت پیشہ تھے اور ان میں بڑے زمیندار بھی تھے۔ دیہات پر انہی کی حکومت تھی۔ ان میں سے ایک زمیندار جس کی عمر بیالیس سال کے لگ بھگ تھی، دن دیہاڑے قتل ہو گیا۔

آپ نے گھوڑے کی ذہانت کے مظاہرے شاید دیکھے ہوں گے کسی کا گھوڑا چوری ہو جائے اور چور اُسے مالک کے گھر سے بیسیوں میل دُور کیوں نہ لے جائیں، اگر اُسے موقع مل جائے تو وہ اپنے مالک کے گھر واپس آجاتا ہے۔ گھوڑا کُتے جیسا وفادار جانور ہے۔ اس مقتول زمیندار کے پاس اعلیٰ نسل کی گھوڑی تھی۔ یہ گھوڑی سات آٹھ سالوں سے

اُس کے پاس تھی۔ مالک نے اُسے بڑے لاڈ اور پیار سے رکھا ہُوا تھا۔

یہ زمیندار ایک روز پہلے دوسرے گاؤں میں اپنی گھوڑی پر گیا۔ اُسے اگلے روز واپس آنا تھا۔ صبح کے ساڑھے دس بجے کے لگ بھگ اُس کی گھوڑی اکیلی واپس آئی۔ گھوڑی زمین پر کھُر مارتی اور بے چینی کا اظہار کرتی تھی۔ گھوڑی کا سوار کے بغیر گھر آنا ہی خطرے کی علامت تھی کہ سوار کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آیا ہے لیکن گھوڑی کی زین پر ایک نشانی بڑی صاف تھی۔ زین پر تازہ خون کے تین چار قطرے پڑے ہوتے تھے مقتول کے نوکر اور دونوں بیویوں نے شور شرابہ کیا۔ گاؤں کے کچھ آدمی گھوڑی کو خالی آتا دیکھ کر پہلے ہی گھوڑی کے پیچھے چلے آرہے تھے۔

مقتول کا بھائی بھی آگیا اور وہ گھوڑی پر سوار ہو گیا۔ گھوڑی اپنے آپ چل پڑی۔ تھانے میں رپورٹ دینے والوں نے مجھے بتایا کہ گھوڑی اپنے آپ ہی موڑ مڑتی گئی اور بہت تیز چلتی گئی۔ سوار نے لگام ڈھیلی چھوڑ رکھی تھی۔ گھوڑی نے اُس جگہ سب کو پہنچا دیا جہاں مقتول کی لاش پڑی تھی۔ گاؤں کے کئی آدمی گھوڑی کے پیچھے موقعۂ واردات تک پہنچ گئے تھے۔

میں جب وہاں گیا تو مجھے جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت تھی وہ غائب ہو چکی تھی۔ یہ تھے قاتل یا قاتلوں کے کھُرے جو لوگوں نے پاؤں تلے مَسل ڈالے تھے۔ میں نے وہاں کی زمین دیکھی۔ یہ کھُرے محفوظ رکھنے کے قابل تھی ہی نہیں۔ گھنی گھاس تھی۔ چھوٹے چھوٹے ہرے سرکنڈے اور جھاڑیاں تھیں۔ اس گھاس اور جھاڑیوں کے درمیان پیدل چلنے والوں نے دو اڑھائی فٹ چوڑا راستہ بنا رکھا تھا۔ اس پر کھُرے ہو سکتے تھے لیکن تماشائیوں نے یہ غائب کر دیئے تھے۔

یہ کم وبیش ایک سَو قدم لمبا اور پچاس قدم چوڑا نشیب تھا۔ اس کی گہرائی بیس فٹ کے لگ بھگ ہو گی۔ آمنے سامنے دو اطراف

اس میں گھاٹیاں اُترتی تھیں۔ دوسری اطراف سے بھی اُترا جا سکتا تھا۔ اس کے کنارے ڈھلانی تھے۔ بعض جگہوں سے عمودی بھی تھے۔ اس میں بارشوں کا پانی جمع ہو جاتا تھا۔ اُوپر کھیت تھے جو زیادہ نہیں تھے۔ ایک طرف علاقہ ناہموار تھا۔ اِدھر سے گزرنے والے اس لمبے چوڑے نشیب میں سے گزرتے تھے کیونکہ یہ شارٹ کٹ تھا۔ اگر اس میں پانی جمع ہوتا تو بھی ایک طرف سے گزرا جا سکتا تھا۔ جن دنوں کی یہ واردات ہے اُن دنوں اس میں بہت تھوڑا درمیان میں پانی تھا۔ پانی کی وجہ سے ہی اس نشیب میں گھاس اور دیگر اقسام کی ہریالی زیادہ تھی۔ ایسی زمین پر کھُرے نہیں دیکھے جا سکتے۔

لوگوں کو وہاں سے دُور ہٹا دیا گیا۔ مقتول کے صرف بھائی کو میں نے اپنے ساتھ رکھا۔ لاش پیٹھ کے بل پڑی تھی۔ کپڑے خون سے سُرخ ہو گئے تھے اور خون تازہ تھا۔ خشک نہیں ہُوا تھا۔ مر جانے کی وجہ سے خون بہنا بند ہو گیا تھا۔ زخموں کی حالت سے پتہ چلتا تھا جیسے ابھی تک خون رِس رہا ہو۔ زخم کچھ کم نہیں تھے۔ مجھے اب زخموں کی تعداد یاد نہیں رہی۔ زیادہ تر زخم کلہاڑی کے تھے۔ ایک ران پر کلہاڑی کے دو گہرے زخم تھے۔ انہیں دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ یہ زخم اُس وقت آتے ہوں گے جب مقتول ابھی گھوڑی پر سوار تھا۔

کلہاڑیوں کے دیگر زخموں کے علاوہ دو یا تین زخم ایسے تھے جو لمبوترے نہیں بلکہ گہرے تھے۔ ان میں سے ایک پیٹ پر اور دو سینے پر تھے۔ اپنے تجربے کی بنا پر میں نے ان کو برچھی کے زخم لکھا۔ مقتول کی پیٹھ پر کلہاڑی کے دو زخم تھے۔

اتنے زیادہ زخموں سے یہی رائے ذہن میں آتی تھی کہ یہ قتل شدید عداوت یا انتقام کی بنا پر کیا گیا ہے۔ یہ واردات رہزنی کی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ رہزنی شام کے بعد ہُوا کرتی تھی۔ یہ رواج پاکستان میں دیکھا ہے کہ دن دیہاڑے رہزنی اور ڈکیتی کی وارداتیں ہو رہی ہیں۔ ہمارے

وقتوں میں رہزنی اور ڈکیتی کا شمار سنگین وارداتوں میں ہوتا تھا۔ پولیس کے بالائی افسر علاقے کے تھانیداروں کی جان کو آ جاتے تھے اور ترقی کا دارومدار اِنہی وارداتوں کی کامیاب تفتیش پر ہوتا تھا۔

خاندانی یا ذاتی عداوت تو عام رواج تھا۔ یہ رواج سکھوں میں تھا اور مسلمانوں میں کچھ زیادہ ہی تھا۔ اس واردات کا باعث عداوت ہی ہو سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ باعث یہی ہُوا تو مجھے تفتیش میں سہولت مل جائے گی، مگر یہ میرا وہم ہی ثابت ہُوا۔ تھانے سے موقعۂ واردات کو آتے ہوئے میں نے اپنے ساتھ آنے والوں سے دریافت کیا۔ مجھے یقین سے بتایا گیا تھا کہ مقتول کی کسی کے ساتھ خونی دشمنی نہیں تھی، لیکن میں نے اسے سچ نہیں سمجھا تھا۔ مجھے خیال تھا کہ خاندانی نہیں تو ذاتی دشمنی ضرور ہو گی۔ مقتول کی عمر چالیس سال سے ڈیڑھ دو سال ہی زیادہ تھی۔ اُن وقتوں میں اسے جوانی کی عمر کہا جاتا تھا۔ ویسے بھی مقتول بڑا زمیندار ہونے کی وجہ سے تندرست و توانا تھا۔ دشمنی کی یہ وجہ ہو سکتی تھی کہ کسی کی بیوی یا بہن بیٹی کے ساتھ اس کے تعلقات ہوں گے اور اسی سلسلے میں یہ مارا گیا۔ میرا شک سکھوں پر بھی تھا۔

لاش کے معائنے کے بعد میں نے اردگرد دیکھنا شروع کیا۔ ایک تو گھاس پر لوگوں کے قدموں کے نشان تھے لیکن جس طرح گھاس، سبز سرکنڈے اور ہری جھاڑیاں ٹوٹی پھوٹی ہوئی تھیں اس سے پتہ چلتا تھا کہ گھوڑی اِدھر اُدھر ہٹتی بڑھتی رہی ہے یعنی سوار گھوڑی کو اِدھر اُدھر سے نکالنے کی کوشش کرتا رہا ہے لیکن قاتلوں نے گھوڑی کو راستہ نہیں دیا تھا۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا تھا کہ قاتل ایک نہیں تھا۔ مقتول کی ران پر جو زخم تھے وہ بتاتے تھے کہ کلہاڑیوں کی ضربوں سے اُسے گھوڑی سے گرایا گیا ہے اور گھوڑی کے دوسری طرف کے قاتل کے پاس برچھی تھی جو اُس نے اُس وقت مقتول پر استعمال کی جب وہ ابھی گھوڑی کی پیٹھ پر تھا۔

لاش سے دو تین گز دُور ایک ہنٹر پڑا ہُوا تھا۔ اُن وقتوں میں جب لوگ گھوڑسواری کرتے تھے تو سوار بید کی خوبصورت سی چھڑی ہاتھ میں رکھتے تھے اور بعض وضعدار آدمی چمڑے کا ایک خوبصورت ہنٹر رول کر کے ہاتھ میں رکھتے تھے۔ یہ ہنٹر جو عموماً دو گز یا اس سے ذرا زیادہ لمبا ہوتا تھا، چمڑے کا بنا ہُوا چمکدار ہوتا تھا۔ بید کی چھڑی یا ہنٹر ساتھ رکھنا فیشن تھا۔ ہاتھ میں یہ چیزیں اچھی لگتی تھیں۔

مجھے بتایا گیا کہ مقتول جب باہر نکلتا تھا تو یہ ہنٹر اپنے ہاتھ میں رکھتا تھا۔ یہ تو میں نے مقتول کے کپڑوں سے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ شوقین آدمی تھا۔ اُس نے دو گھوڑا بوسکی کے کپڑے کی شلوار اور قمیض پہن رکھی تھی اور سر پر پشاوری لُنگی تھی جو تِلے دار کُلّے پر بندھی ہوئی تھی اور لاش سے تین چار گز دُور پڑی تھی۔

لاش سے کچھ دُور پڑی ہوئی ایک اور چیز مجھے ملی۔ یہ برچھی کی تین دھاری اَنی تھی جو برچھی سے ٹوٹ کر الگ ہوتی تھی۔ برچھی کی لکڑی اس کے اندر تھی اور جو لکڑی باہر آتی ہوئی تھی وہ چار یا پانچ انچ لمبی تھی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ یہ ابھی ابھی ٹوٹی ہے جس کا ثبوت یہ تھا کہ ٹوٹا ہُوا سرا ذرا سا بھی مَیلا نہیں تھا۔ برچھی کی اَنی خون آلود تھی جو ثبوت تھا کہ یہی اَنی مقتول کے جسم میں ماری گئی تھی۔ میں نے ہنٹر اور یہ اَنی قبضے میں لے لی۔

کھوجی کھُرے دیکھنے کے لئے گھاٹیوں کی طرف چلا گیا تھا لیکن کھُرے ملنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ لوگ گھاٹیوں سے اُترتے چڑھتے رہے تھے اور یہ سلسلہ جاری تھا۔ گاؤں سے چارپائی آگئی تھی۔ لاش کو چارپائی پر ڈالا گیا اور میں نے اسے پوسٹ مارٹم کے لئے بھیج دیا۔ میں خود مقتول کے گاؤں کی طرف چل پڑا۔ موقعۂ واردات گاؤں سے بمشکل ایک مِیل دُور تھا۔

نئی اور نوجوان سوکن

میں نے نمبردار کی ڈیوڑھی میں ڈیرے ڈال دیئے۔ سب سے پہلے نمبردار کو اپنے پاس بٹھایا۔ نمبردار اِسی خاندان کا تھا۔ میں نے اُس سے کہا کہ وہ مقتول اور اس کے خانگی معاملات اور دیگر احوال کے متعلق جو کچھ بھی جانتا ہے، مجھے بتاتے۔ پہلے تو یہ معلوم کرنا تھا کہ مقتول کردار کے لحاظ سے کیسا تھا۔ نمبردار نے جو کچھ بتایا اس سے میں نے یہ رائے قائم کی کہ مقتول اُنہی بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں جیسا تھا جن کی کہانیاں پڑھتے بھی رہتے ہیں اور ٹی وی کے ڈراموں میں دیکھتے بھی رہتے ہیں، لیکن وہ اپنے نوکروں، گاؤں کی کمین ذاتوں اور مزارعوں کے ساتھ بے انصافی اور اُن پر تشدد کرنے والا آدمی نہیں تھا۔ سب کی عزت کرتا اور عزت کرواتا تھا، لیکن میں اس سے یہ مطلب اخذ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ شریف آدمی تھا۔ نمبردار نے بتایا کہ مقتول شراب بھی پیتا تھا۔ میرے پوچھنے پر نمبردار نے یہ بھی بتایا کہ گاؤں کی کسی عورت کے ساتھ مقتول کے قابلِ اعتراض مراسم نہیں تھے۔ اُس نے یہ بات اس لئے وثوق کے ساتھ کہی کہ گاؤں میں کسی کا پردہ نہیں رہتا۔

ایک بات یہ بھی سامنے آئی کہ مقتول شوقین آدمی تھا اور زندہ دل بھی تھا۔ اُس کے گھر کے متعلق نمبردار نے بتایا کہ اُس کی دو بیویاں تھیں۔ ایک پُرانی تھی جس کی عمر پینتیس سال کے لگ بھگ تھی اور دوسری نئی تھی جس کی عمر اکیس بائیس سال تھی۔ یہ دوسری شادی مقتول نے تقریباً چار مہینے پہلے کی تھی۔ نمبردار نے دوسری شادی کی وجہ یہ بتائی کہ پہلی بیوی سے تین بیٹیاں تھیں۔ بیٹا کوئی نہیں تھا۔ اُس نے بیٹے کی خاطر دوسری شادی کی تھی۔ پرانی بیوی اُس کے ساتھ ہی رہتی تھی۔

یہ دشمنی بڑی صاف تھی۔ میں نے نمبردار سے پوچھا کہ پُرانی بیوی کے بھائی وغیرہ ہیں؟ اور یہ بھی پوچھا کہ پُرانی بیوی اور اُس کے بھائیوں وغیرہ کا ردِعمل کیا تھا اور اب کیا ہے؟

"جناب ملک صاحب!" — نمبردار نے جواب دیا — "آپ خود سیانے ہیں۔ اِن لوگوں نے شور شرابہ تو کرنا ہی تھا مگر اب چُپ ہو گئے ہیں .... پرانی بیوی کے دو بھائی ہیں۔ ان کے دلوں میں چوہدری شاہباز (مقتول) کے خلاف ناراضگی تو ہے لیکن ظاہری طور پر انہوں نے آپس میں سلام دعا رکھی ہوئی تھی۔"

"بھائیوں نے کبھی غصے کا اظہار کرتے ہوئے مقتول کے خلاف کوئی بات کی ہوگی" — میں نے کہا — "انہوں نے اپنی بہن پر سوکن لانے کا انتقام لینے کی بات کی ہوگی۔"

"نہیں ملک صاحب!" — نمبردار نے کہا — "میرے سامنے انہوں نے ایسی بات کبھی نہیں کی نہ یہ سُنا ہے کہ انہوں نے کسی اور کے ساتھ کی ہے۔"

"دیکھ چوہدری!" — میں نے نمبردار سے کہا — "مقتول تمہاری برادری کا آدمی تھا اور اُس کے سالے بھی تمہاری برادری کے ہیں۔ اگر تم اِن دونوں بھائیوں کو بچانے کی کوشش میں ہو تو میرے ہاتھوں بہت نقصان اُٹھاؤ گے۔ مجھے سو فیصد صحیح رپورٹ دو۔ اپنی رشتہ داریاں، اپنی دوستی اور دُشمنی کو بھول جاؤ۔"

اُس نے ہاتھ جوڑ کر اور قسمیں کھا کھا کر کہا کہ وہ پوری دیانت داری سے رپورٹ دے رہا ہے لیکن مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ ایک طرف تو یہ نمبردار پولیس کے آگے بچھ بچھ جاتے تھے مگر کسی کی حمایت کرنا چاہتے تو تجربہ کار تھانیداروں کو بھی گُمراہ کر دیا کرتے تھے۔ میں نے اسی نمبردار کی رپورٹ پر ہی تفتیش نہیں کرنی تھی۔ میرے پاس دوسرے ذرائع بھی تھے جن سے میں نے یہ بھی معلوم کرنا تھا کہ یہ نمبردار کس کا

حمایتی اور کس کا مخالف ہے۔ سرِدست میرے لئے یہی بات کافی تھی کہ مقتول نے پُرانی بیوی کی موجودگی میں ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ شادی کی تھی۔ قتل کا یہی باعث کافی ہوتا ہے۔

قتل کا دوسرا باعث جائیداد کا تنازعہ ہوتا ہے۔ مقتول کا ایک سگا بھائی اور دو چچازاد بھائی تھے۔ نمبردار نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ جائیداد کا کوئی تنازعہ نہیں۔ دونوں بھائیوں کی زمین وغیرہ الگ الگ ہے۔ چچازاد بھائیوں کی جائیداد الگ ہے۔

نہری علاقوں میں کھیتوں کو پانی لگانے کی باری پر عموماً جھگڑے ہوتے ہیں جو دائمی عداوت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ نمبردار نے بتایا کہ کسی کے ساتھ ایسا بھی کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ اس سلسلے میں پٹواری کا رول اہم ہوتا ہے۔ پٹواری مقتول کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے باوجود مقتول نے پانی کی باری پر کسی کا کبھی حق نہیں مارا تھا۔

نمبردار سے میں نے کچھ اور باتیں پوچھ کر مقتول کے بھائی کو بلایا اور نمبردار کو یہ کہہ کر باہر بھیج دیا کہ وہ اپنے طور پر سراغرسانی کرتا رہے۔ مقتول کا بھائی مقتول سے اڑھائی تین سال چھوٹا اور بیوی بچوں والا تھا۔ میں نے اُس سے بھی پوچھا کہ مقتول کی خاندانی یا ذاتی دُشمنی کس کے ساتھ تھی؟

"نہیں جی!" — اس نے دو ٹوک لہجے میں جواب دیا — "میرا بھائی دُشمن نہیں دوست بنایا کرتا تھا۔ اگر اُس کا یا ہمارے خاندان کا کوئی دُشمن ہوتا تو بھائی کے قتل پر ہم تھانے نہ جاتے۔ پہلے اپنے دُشمن کو اسی طرح کلہاڑیوں سے کاٹتے پھر دیکھتے کہ اب کیا ہوتا ہے۔"

"تمہارے بھائی نے گھر میں ایک اور بیوی لا کر دُشمن تو پیدا کر لئے تھے" — میں نے کہا۔

"یہ اُس کی ضرورت تھی" — اُس نے کہا — "جائیداد کا وارث تو پیدا ہونا چاہیئے تھا۔ لڑکیاں تو وارث نہیں ہُوا کرتیں۔"

"اب اُس کی جائیداد کا وارث کہاں سے پیدا ہو گا؟" ــــ میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"چھ مہینوں بعد پیدا ہو گا" ــــ اُس نے بڑے اطمینان سے کہا ــــ "میرا بھائی اپنا نشان چھوڑ گیا ہے۔ اُس کی نئی بیوی اللہ کے کرم سے امید سے ہے۔ میری بیوی نے مجھے بتایا ہے کہ تین مہینے پورے ہو گئے ہیں۔"

"یہ تمہارا وہم ہے چوہدری!" ــــ میں نے کہا ــــ "نوجوان لڑکی اللہ کا شکر ادا کر رہی ہو گی کہ اپنے باپ کی عمر کے خاوند سے آزادی ملی۔ وہ اب کسی جوان آدمی کے ساتھ شادی کرے گی۔"

"جناب عالی!" ــــ مقتول کے بھائی نے کہا ــــ "میں اُسے کسی اور کے ساتھ شادی نہیں کرنے دوں گا۔ میں خود اُس کے ساتھ نکاح پڑھاؤں گا۔ اُس کے بچے کو پالوں گا اور اپنے بھائی کی تمام جائیداد اُس کے نام رجسٹری کرا دوں گا۔ اُس کی پہلی بیوی اور اُس کے بیٹوں کا جو تھوڑا بہت حق بنتا ہے وہ انہیں دے دوں گا۔"

میرا مسئلہ یہ نہیں تھا کہ اس شخص نے جو بات کی تھی وہ اچھی تھی یا بُری، میں تو اُس کے بھائی کے قتل کا معمّہ حل کرنے کی فکر میں تھا۔ اُس نے جب یہ بتایا کہ مقتول کی نئی بیوی تین ماہ سے امید سے تھی تو میرے ذہن میں فوراً یہ خیال آیا کہ مقتول جائیداد کا وارث پیدا کرنا چاہتا تھا۔ پرانی بیوی نئی بیوی کو دیکھ رہی تھی کہ وہ جائیداد کا وارث پیدا کرنے کی پوزیشن میں آ گئی تھی۔ یہ تو سوائے اللہ کے کوئی بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ لڑکا پیدا ہو گا یا لڑکی، البتہ پرانی بیوی کو یہ ڈر تھا کہ لڑکا پیدا ہو گیا تو جائیداد اُس کے نام ہو جائے گی اور وہ بیوی ملکہ بن جائے گی جسے اس گھر میں آئے ابھی چار مہینے ہوئے ہیں۔

یہ صورتِ حال قتل کا باعث بن سکتی تھی لیکن قابلِ غور نکتہ یہ تھا کہ قتل نئی بیوی کو ہونا چاہیئے تھا۔ نہ بانس رہتا نہ بانسری بجتی۔ اس لڑکی کے

خاوند کو قتل کر کے پرانی بیوی کو کیا حاصل ہو سکتا تھا؟

"میرے ایک سوال کا جواب سوچ کر دو" ــــ میں نے مقتول کے بھائی سے پوچھا ــــ "کیا تمہیں اپنے بھائی کی پرانی بیوی کے بھائیوں پر شک ہے؟"

"اگر ان پر شک ہوتا تو میں تھانے میں جناب کو ضرور ان کا نام لکھواتا" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "ان میں اتنی جان نہیں کہ چوہدری شاہباز پر ہاتھ اُٹھاتے۔ اگر ان میں اتنی ہمت ہوتی تو جس روز میرے بھائی نے دوسری شادی کی تھی، اُسی روز اپنی بہن کو اپنے گھر لے جاتے اور کہتے کہ ہماری بہن سوکن کے ساتھ نہیں رہے گی۔ دوسری بات یہ ہے کہ میرے بھائی کو پرانی بیوی نے راضی خوشی لڑکا پیدا کرنے کی امید پر دوسری شادی کی اجازت دی تھی۔"

وہ انگریزوں کا دورِ حکومت تھا۔ مسلمانوں پر ایسی پابندی نہیں تھی کہ وہ پہلی بیوی کی اجازت کے بغیر دوسری شادی نہیں کر سکتے۔

"نئی بیوی کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟" ــــ میں نے پوچھا ــــ "کہیں ایسا تو نہیں کہ اُسی نے بوڑھے خاوند سے آزادی حاصل کرنے کے لئے ....؟"

"توبہ کرو جی!" ــــ مجھے آج تک یاد ہے اُس نے میری بات کاٹ کر کہا تھا ــــ "ان لوگوں میں اتنی جرأت کہاں جنہوں نے اپنی بیٹی کی نقد قیمت وصول کی تھی۔ وہ تو مر مٹ کر گزارہ کرنے والے لوگ ہیں۔"

"غریب ہیں؟"

"نہ جی!" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "غریب نہیں۔ درمیانہ درجے کے لوگ ہیں۔ لڑکے تو ٹھیک ٹھاک ہیں، ان کے ماں باپ ذرا لالچی سے لوگ ہیں۔ انہوں نے میرے بھائی کو بہت کھایا ہے۔"

"چوہدری! کچھ تو بتاؤ" ــــ میں نے سٹپٹا کر کہا ــــ "قتل کی وجہ انتقامی ہے۔ کیا تم اپنے بھائی کے کسی دشمن کو نہیں جانتے؟ .... کیا اُس

نے تمہیں کبھی نہیں بتایا تھا کہ فلاں آدمی کے ساتھ اُس کا کبھی لڑائی جھگڑا ہُوا ہے؟"

"ہمارا آپس میں بہت پیار تھا" — اُس نے کہا — "وہ مجھے اپنے دل کی، اپنے گھر کی ہر بات بتایا کرتا تھا۔"

میں نے اس شخص کو بہت کھنگالا لیکن معمولی سا بھی کوئی سراغ نہ ملا۔ مجھے یہ شک ہو رہا تھا کہ مقتول کے تعلقات کسی عورت کے ساتھ ہوں گے اور اس کا کسی کو علم نہیں ہوگا۔ عورت کے بھائیوں یا خاوند کو پتہ چل گیا ہوگا۔ یہ میں نے اپنے خفیہ ذرائع سے معلوم کرنا تھا۔ اس سے پہلے دونوں بیویوں کو دیکھنا ضروری تھا۔

مقتول کے بھائی سے کہا کہ وہ چوہدری کی دونوں بیویوں کو لے آئے۔

دونوں بیویاں آگئیں۔

مسجد کا پیش امام اور ہندو عامل

پرانی بیوی کو بلایا اور اُسے اپنے پاس بٹھا کر میں باہر نکلا۔ مقتول کے بھائی کو میں نے فارغ کر دیا تھا۔ اُسے پھر بلایا اور باہر کھڑے کھڑے اُس سے پوچھا کہ مقتول جن کے ہاں دوسرے گاؤں گیا تھا وہ کون لوگ ہیں اور کیسے ہیں۔

"اچھے لوگ ہیں" — اُس نے جواب دیا — "میرے بھائی کے پُرانے دوست ہیں۔"

میں نے اُس سے ان لوگوں کا گاؤں وغیرہ معلوم کر کے اپنے ساتھ آئے ہوئے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ وہ اُس گاؤں جا کر ان دو آدمیوں کو اپنے ساتھ لے آئے جو مقتول کے دوست تھے۔ میں اندر گیا۔ مقتول کی پرانی بیوی میرے انتظار میں بیٹھی تھی۔ میں اُسے پرانی بیوی کہہ رہا ہوں لیکن عمر کے لحاظ سے وہ پرانی نہیں تھی۔ اُس کی عمر پینتیس

سال کے لگ بھگ تھی۔ یہ جوانی کی عمر ہوتی ہے۔ ویسے بھی اُس کی صحت اچھی تھی۔ رنگ گندمی تھا اور نقش زیادہ اچھے نہیں تھے۔ اُس کی آنکھیں رو رو کر سرخ ہو گئی تھیں۔ میں نے اُس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا پھر اُس سے پوچھا کہ اُس کے خاوند کا قاتل کون ہو سکتا ہے۔

"میں کچھ نہیں کہہ سکتی" — اُس نے کہا — "کوئی ایسا دشمن نہیں جس کا نام لوں۔ میں کسی پر بلاوجہ شک نہیں کروں گی۔"

"تمہارے خاوند کی دوسری بیوی نے تو تمہیں بیوہ نہیں کر دیا؟" مجھے توقع تھی کہ وہ اپنی سوکن کے خلاف بولے گی۔ کہے گی کہ قتل میں اسی لڑکی کا ہاتھ ہے لیکن اُس نے تحمل سے کہا کہ اس لڑکی کا کون اتنا ہمدرد ہے جو اس کی خاطر اس کے خاوند کو قتل کر دیتا۔

"کیا تمہاری یہ سوکن خاوند کے ساتھ خوش تھی؟"

"اس نے خوش تو ہونا ہی تھا" — پرانی بیوی نے جواب دیا — "چوہدری جو اُس کے ساتھ خوش تھا۔ اُس کا ہر طرح خیال رکھتا تھا۔"

"تم سے تو چوہدری نے نظریں پھیر لی ہوں گی" — میں نے کہا۔

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "میرے ساتھ تو وہ پہلے سے زیادہ اچھا ہو گیا تھا۔ مجھے صرف یہ غم تھا کہ خدا نے مجھے بیٹا نہ دیا۔ میری قسمت میں بیٹیاں ہی لکھی تھیں۔"

"کیا یہ صحیح ہے کہ تمہارے خاوند نے دوسری شادی تمہاری مرضی سے کی تھی؟" — میں نے پوچھا۔

"کوئی عورت نہیں چاہتی کہ اس کے گھر میں سوکن آئے" — اُس نے جواب دیا — "میں اگر چوہدری سے ناراض ہوتی اور کہتی کہ وہ دوسری شادی نہ کرے تو بھی اُس نے دوسری شادی کر لینی تھی۔ اُسے ایک بیٹے کی ضرورت تھی۔ میری عمر آگے ہوتی جا رہی تھی۔ چوہدری کی عمر چالیس سے اُوپر ہو گئی تھی۔ ابھی تو اُس کا جسم جوان تھا لیکن اُس

نے کہنا شروع کر دیا کہ وہ بوڑھا ہو رہا ہے اور اُس کا بیٹا پیدا نہیں ہو رہا۔ میں اُسے کہتی تھی کہ تین بیٹیوں کے بعد خدا بیٹا ضرور دے گا۔ میں نے کوئی پیر فقیر نہیں چھوڑا۔ دُور دُور تک خانقاہوں اور مزاروں پر جاجا کر ماتھا رگڑا۔ جس کسی نے کوئی ٹونہ بتایا وہ کیا۔ منتیں مانیں لیکن خدا کو منظور نہیں تھا کہ میں بیٹے کو جنم دوں۔"

"تم نے کبھی وِرد وظیفہ نہیں کیا تھا؟" — میں نے پوچھا — "نماز کبھی پڑھی ہے؟"

"اپنی مسجد کے پیش امام نے ایک وظیفہ بتایا تھا" — اُس نے جواب دیا — "اور کہا تھا کہ پانچوں وقت نماز پڑھا کرو۔ میں نے پندرہ سولہ دن نماز بھی پڑھی اور وظیفہ بھی کیا لیکن یہ سب بے اثر نکلا اور میں نے چھوڑ دیا۔"

یہ عورت نماز اور وظیفے کو بھی ٹونہ ٹوٹکا سمجھتی تھی۔ اُس کی سب سے چھوٹی بچی پانچ سال کی ہو گئی تھی اور آگے بچہ ہونے کے آثار ہی پیدا نہیں ہو رہے تھے۔ ایک ہندو عامل نے جو دراصل کالے علم کا عامل تھا، اُسے کہہ دیا تھا کہ اُس پر کسی نے کالا عمل کرا دیا ہے جس کے اثر سے وہ بانجھ ہو گئی ہے۔ اس ہندو نے اُس سے بہت رقم بٹوری اور امید دلائی تھی کہ چھ مہینے بعد وہ امید سے ہو سکے گی۔ اُس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ لڑکا ہو گا یا لڑکی۔

"میں نے چوہدری کو بتا دیا" — اس بدقسمت عورت نے مجھے سنایا — "چوہدری اُس کے پاس گیا اور چوہدرانی کو آکر یہ خبر سنائی کہ کالے عمل کے اس عامل نے کہا ہے کہ وہ چوہدرانی کو مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا، اصل بات یہ ہے کہ کالا عمل اتنا سخت کیا گیا ہے کہ چوہدرانی کی کوکھ ہمیشہ کے لئے بیکار ہو گئی ہے اور وہ کبھی بھی کسی نئے بچے کی ماں نہیں بن سکے گی۔"

اس ہندو کے اس انکشاف پر مقتول نے دوسری شادی کا

فیصلہ کر لیا۔ اُس کی بیوی کے بیان کے مطابق وہ بیوی کے آگے رو پڑا اور کہنے لگا کہ وہ جائیداد کا وارث پیدا کئے بغیر مر جائے گا۔ اُس نے بیوی کے ساتھ وعدہ کیا کہ بیوی اگر سوکن کو دل سے قبول کر لے اور گھر میں اُس کے ساتھ لڑائی جھگڑا نہ کرے تو چوہدری ابھی اُس کے نام اراضی کا کچھ حصہ چوہدرانی کے نام رجسٹری کر دے گا۔

"میرے دل میں چوہدری کی جو محبت تھی اس نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اُس کی خواہش پوری کروں" — مقتول کی بیوی نے کہا — "وہ اچانک مر گیا ہے لیکن میرے دل میں اُس کی محبت نہیں مر سکتی۔ چوہدری مجھے دل سے اور جان سے چاہتا تھا۔ میں اُسے اتنا افسردہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ یہ اُس کی محبت تھی کہ اُس نے مجھ سے دوسری شادی کی اجازت لی تھی۔ مسلمان خاوند بیویوں کو بتائے بغیر دو دو تین تین بیویاں بیاہ لاتے ہیں۔ چوہدری مجھ سے نہ پوچھتا تو میں اُس کا کیا بگاڑ سکتی تھی۔ میں نے اُسے کہا کہ میں اُس کے راستے میں نہیں آؤں گی، وہ دوسری شادی کر لے۔ میں نے اُسے دعائیں دیں کہ خدا اُسے بیٹا دے۔"

شادی کے بعد چوہدری نے کچھ زمین اپنی پہلی بیوی کے نام رجسٹری کر دی تھی۔

"کیا تم نے اپنے بھائیوں اور والدین کو بتایا تھا؟" — میں نے کہا — "تم نے ضرور بتایا ہو گا کہ چوہدری نے تمہارے نام اتنی زمین رجسٹری کرا دی ہے۔"

"ہاں جی!" — اُس نے کہا — "میں نے تو بڑی خوشی سے انہیں بتایا تھا۔ رجسٹری میرے ماں باپ کے گھر میں رکھی ہوتی ہے۔"

میں نے بعد میں یہ رجسٹری دیکھی تھی۔ مقتول نے اپنی اراضی کا چوتھا حصہ اپنی بیوی کو دے دیا تھا۔ میں تو اسے سخاوت کہوں گا۔

"کیا تمہارے والدین اور بھائی بھی یہ رجسٹری دیکھ کر خوش

ہوتے تھے؟" ــــ مَیں نے پوچھا۔

"ہاں جی!" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "وہ تو چوہدری کی تعریفیں کرتے تھے۔"

"لیکن وہ چوہدری کی دوسری شادی پر تو خوش نہیں ہوں گے" ــــ مَیں نے کہا۔

"یہ تو قدرتی بات ہے" ــــ اُس نے کہا ــــ "ماں باپ کو تو افسوس ہوتا ہی ہے کہ اُن کی بیٹی کو خدا بیٹیاں ہی دے رہا ہے اور اُس پر سوکن آگئی ہے مَیں نے اپنے ماں باپ اور بھائیوں کو بتا دیا کہ چوہدری مجھ پر زبردستی سوکن نہیں لایا بلکہ میری مرضی سے لایا ہے۔"

"اور تمہارے بھائی؟"

"میں نے انہیں بھی سمجھا لیا تھا" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "مجھے اعتراض نہیں تو انہیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ وہ اپنے بال بچوں والے ہیں۔ میں نے انہیں تسلی دے دی تھی کہ چوہدری میرے ساتھ پہلے سے زیادہ ٹھیک رہتا ہے۔"

اس عورت کے اس بیان سے میں پریشان ہو گیا۔ توقع تو یہ تھی کہ یہ کہے گی کہ خاوند ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا اس لئے اُس نے بہانہ یہ بنایا کہ اُس نے ایک بیٹے کی امید پر شادی کی ہے۔ مجھے امید تھی کہ یہ عورت بھڑکی ہوئی ہو گی اور ہو سکتا ہے یہ بھی کہہ دے کہ اُس کے خاوند کو اس دوسری بیوی نے قتل کرایا ہے کیونکہ وہ اتنی زیادہ عمر کے آدمی کے ساتھ خوش نہیں تھی اور اس کے باپ نے مقتول سے پیسہ لے کر بیٹی کو اس کے ساتھ زبردستی بیاہ دیا تھا لیکن اس چوہدرانی نے میری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ میں نے مقتول کی نوجوان بیوی کی طرف رُخ پھیر دیا۔

"اب اپنی سوکن کی بات کرو" ــــ میں نے کہا ــــ "ظاہر ہے کہ گھر میں تم اس کا وجود برداشت نہیں کرتی ہو گی۔"

"نہ جی نہ" ــــ چوہدرانی نے میری پوری بات سُنے بغیر کہا ــــ "میں نے اس لڑکی کو دل سے قبول کر لیا تھا۔ دل کو دُکھ تو بہت پہنچا تھا لیکن دل پر پتھر رکھ لیا۔ میں نے یہ بھی سوچ لیا تھا کہ یہ لڑکی اپنی مرضی سے میری سوکن بن کر نہیں آئی۔ اس کے ماں باپ نے چوہدری کو بہت کھایا تھا۔ ان کے گھر میں تعلیم بھی ہے۔ مجھے پوری طرح تو معلوم نہیں کہ لڑکی کا رشتہ دینے کے لئے انہوں نے چوہدری سے کتنی رقم لی تھی، یہ یقین ہے کہ انہوں نے نقد رقم لی تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ لڑکی اس رشتے میں راضی نہیں تھی۔"

"تمہارے ساتھ اس کا سلوک کیسا رہا ہے؟" ــــ میں نے پوچھا۔

"ٹھیک ٹھاک!" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "یہ صحیح ہے کہ میرا خاوند زیادہ تر اسی کو گھر میں اپنے ساتھ رکھتا تھا لیکن اُس نے اِس لڑکی کو کہہ رکھا تھا کہ گھر میں حکم بڑی چوہدرانی کا چلے گا .... میں نے اُسے کہا تھا کہ عزت کرنا اور عزت کروانا اور چوہدری پر قبضہ کرنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ پچھتاؤ گی۔ میں نے پہلے دن ہی اُسے یہ بات کہہ دی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور کہنے لگی کہ اُس کے ساتھ زبردستی ہوئی ہے، اب وہ اپنی بگڑی ہوئی قسمت کو اور نہیں بگاڑے گی....

"اُس کا مطلب یہ تھا کہ وہ میرے ساتھ بگاڑ پیدا نہیں کرے گی۔ آپ کو شاید میری بات پر یقین نہ آئے، میرے دل میں اس لڑکی کی ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ عورت کی مجبوری کو آپ سمجھتے ہی ہیں۔ چوہدری کے دل میں اس لڑکی کی محبت تو ہو گی لیکن وہ اس لڑکی کو بیٹے پیدا کرنے والی مشین سمجھ کر لایا تھا۔ یہ سوچ کر میں نے اس لڑکی کو سچے دل سے قبول کر لیا اور اس کے ساتھ اپنی بہنوں جیسا سلوک شروع کر دیا۔ لڑکی عقل والی نکلی۔ اس نے میرے اچھے سلوک کا جواب بہت اچھے سلوک سے دیا۔"

"ایک بات بتاؤ چوہدرانی!" ــــ میں نے اُس سے پوچھا ــــ

"اس لڑکی کا کسی کے ساتھ معاشقہ تو نہیں چل رہا تھا؟ .... یا تم نے کبھی سُنا ہو کہ یہ فلاں آدمی کو چاہتی تھی؟"

وہ سوچ میں پڑ گئی۔

"میں نے سُنا تو تھا" ــــ اُس نے کہا ــــ "ایک بڑا خوبصورت جوان ہے۔ دو ڈھائی مہینوں سے نظر نہیں آیا۔ میری سوکن کی اُس کے ساتھ بات چیت تھی۔ اسے آپ محبت کہہ لیں، لیکن یہ بات زیادہ مشہور نہیں۔ اگر آپ کسی طرح معلوم کر سکیں تو جھوٹ سچ کا پتہ چل جاتے گا۔"

میں نے اُس سے اس آدمی کا نام پوچھ لیا۔ مجھے چوہدرانی نے بہت مایوس کیا۔ اُس نے میرے سامنے اپنے گھر کی جو تصویر پیش کی وہ میری توقع کے بالکل اُلٹ تھی۔ اس عورت کو تو سوکن کے خلاف بھرا ہُوا ہونا چاہیئے تھا لیکن وہ سوکن کے خلاف ایک لفظ تک نہیں کہہ رہی تھی۔

میں قتل کا باعث معلوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک باعث تو ذاتی یا خاندانی دشمنی ہو سکتا تھا۔ دوسرا یہ کہ قاتل کی دلچسپی مقتول کی نئی بیوی کے ساتھ تھی اور تیسرا باعث یہ کہ مقتول کے کسی عورت کے ساتھ تعلقات تھے اور اس عورت کے خاوند یا بھائیوں کو پتہ چل گیا اور انہوں نے اسے راستہ روک کر قتل کر دیا۔ فوری اشتعال بھی قتل کا باعث ہو سکتا تھا۔

شوقین مزاج اور زندہ دل تھا

میں نے ابھی تک کسی سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ مقتول طبیعت کا کیسا تھا اور لوگوں کے ساتھ اُس کا رویہ، بول چال کا انداز اور سلوک برتاؤ کیسا تھا۔ وہ ذرا بڑے درجے کا زمیندار تھا اس لئے اُس میں اکڑ اور حکم کے رنگ میں بات کرنے کی عادت ہونی چاہیئے تھی۔ میں نے اُس کی پُرانی بیوی سے پوچھا تو اُس نے کہا کہ سارے گاؤں پر اس

کا رُعب بیٹھا ہُوا تھا۔

"مزارعوں اور نوکروں وغیرہ کو گالیاں دیتا ہو گا" ــــ میں نے کہا۔

"یہ تو اُس کی عادت تھی" ــــ چوہدرانی نے جواب دیا ــــ "نوکر اور مزارعے کیا حیثیت رکھتے ہیں، چوہدری سے تو اُونچی ذاتوں کے لوگ، سکھ اور ہندو بھی ڈرتے تھے۔"

"کسی عورت کے ساتھ چوہدری کا تعلق ہو گا" ــــ میں نے پوچھا ــــ "تمہارے کانوں تک کبھی ایسی بات پہنچی تھی؟"

"چوہدری ایسا آدمی نہیں تھا" ــــ اُس نے کہا ــــ "اللہ اُسے سیدھا بہشت میں لے جاتے۔ چوہدری تو ہے ہی جنتی۔"

"دراصل چوہدرانی!" ــــ میں نے کہا ــــ "تم نہیں چاہتیں کہ چوہدری کا قاتل پکڑا جائے اور میں اُسے پھانسی کے تختے پر کھڑا کروں۔"

"میں تو قاتل کو اپنے ہاتھوں قتل کرنا چاہتی ہوں" ــــ اُس نے کہا۔

"پھر مجھ سے سن لو" ــــ میں نے کہا ــــ "اُس کا تعلق کسی عورت کے ساتھ تھا اور اُس کے قتل کی وجہ بھی یہی ہے۔ بتاؤ وہ عورت کون ہے۔"

"خدا کی قسم مجھے معلوم نہیں" ــــ اُس نے کہا ــــ "میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ چوہدری شوقین مزاج آدمی تھا۔ اچھی شکل وصورت دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔"

میں نے چوہدرانی کو اُٹھا دیا اور چار آدمیوں کو باری باری بلایا۔ ان سب سے میں نے مقتول کے کردار اور عادات وغیرہ کے متعلق پوچھا۔ ان میں ایک تو نمبردار تھا، دوسرا انعام خور اور باقی دو اس گاؤں کے معزز آدمی تھے۔ اصل میں دونوں معزز مخبر تھے۔

ان سب نے تقریباً ایک ہی جیسے جواب دیئے۔ ان سب کو ملا کر مقتول کے کردار اور شخصیت کی یہ تصویر بنی کہ وہ شوقین مزاج اور زندہ دل آدمی تھا۔ وہ خوبصورت عورت کو بڑے شوق سے دیکھتا

تھا لیکن عورتوں کا شکاری نہیں تھا۔ اپنے وقار اور رُعب کو قائم رکھنے والا آدمی تھا۔ مزارعوں اور نوکروں چاکروں کے لئے وہ اونچی ذات کے بڑے زمینداروں کی طرح فرعون نہیں تھا لیکن اُن پر گالی گلوچ بہت کرتا تھا۔ بہرحال مقتول بدنام آدمی نہیں تھا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اُس نے کسی عورت کے ساتھ کبھی کوئی نازیبا بات یا حرکت کی ہو۔

ان میں سے تین نے یہ متفقہ رائے دی کہ مقتول نے دوسری شادی بیٹا پیدا کرنے کے لئے ہی کی ہو گی لیکن اُسے یہ لڑکی بہت اچھی لگتی تھی۔ اُس نے اس لڑکی کو خریدا تھا۔

ان چاروں نے میرا یہ شک رفع کر دیا کہ مقتول کے تعلقات کسی سِکھ عورت کے ساتھ تھے۔ گاؤں کے سِکھ جانگلی قسم کے تھے۔ نڈر اور بیوقوفی کی حد تک دلیر تھے لیکن وہ بھی مقتول سے دبکتے اور اُس کی عزت کرتے تھے۔

پھر مجھے یہ بتایا گیا کہ مقتول نے تین بدمعاش آدمیوں کو اپنا غلام بنا رکھا تھا۔ ان میں دو مسلمان تھے اور ایک سِکھ۔ تینوں جُوتے باز، شرابی اور بدکار تھے۔ وارداتیں بھی کر گزرتے تھے۔ ان کی وجہ سے بھی مقتول کے آگے سب دبے دبے رہتے تھے۔ میں ان تینوں میں سے ایک کو جانتا تھا۔ اُس کا نام تھانے میں رجسٹر تھا۔ وہ لسٹ ب کا بدمعاش تھا۔ مجھے معزز مخبروں نے بتایا کہ ان تینوں سے مقتول کی درپردہ زندگی کی باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔

میں نے ان سب سے پوچھا تھا کہ مقتول کی نئی بیوی اخلاقی لحاظ سے کیسی ہے۔ چاروں نے کہا کہ اُس کے اخلاق پر کوئی داغ دھبہ نہیں لگا۔ مقتول کی پہلی بیوی نے ایک جوان لڑکے کا نام لے کر کہا تھا کہ اُس کے ساتھ نئی بیوی کا کچھ نہ کچھ تعلق ضرور تھا۔ میں کہانی سنانے اور اصل نام چھپانے کی خاطر اس نوجوان کا نام فیروز رکھ لیتا ہوں اور لڑکی

کو نسیم کہہ لیں۔

"فیروز نسیم کی شادی سے پہلے نسیم کے گھر جاتا رہتا تھا" — ایک معزز مُخبر نے بتایا — "اِن کی دُور پار کی رشتہ داری بھی ہے۔ سب کہتے تھے کہ فیروز کی شادی نسیم کے ساتھ ہو گی۔ ان کی برادری میں نسیم کا رشتہ دو گھروں نے مانگا تھا۔ دونوں کو جواب مل گیا تھا۔ معلوم نہیں فیروز کا رشتہ نسیم کے ساتھ کیوں نہیں ہُوا تھا۔ شاید اس لئے کہ چوہدری (مقتول) کی نظر بھی اسی پر تھی اور وہ اس گھر پر مہربان تھا۔"

"لڑکی والے رشتہ چوہدری کو دینا چاہتے ہوں گے" — میں نے کہا — "پھر یہ رشتہ چوہدری کو مل گیا .... یہ بتاؤ کہ فیروز کیسا آدمی ہے؟ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ فیروز نے چوہدری کو راستے سے ہٹایا ہو؟"

"یہ سارا معاملہ اتنا درپردہ اور خفیہ رہا ہے کہ مجھ جیسے آدمی کو بھی بھنک نہیں ملی کہ کیا ہوتا رہا اور کیا ہُوا ہے" — اِس مُخبر نے کہا — "میں کچھ اشارے دیتا ہوں، آپ کا دماغ بہت تیز ہے ملک صاحب! خود کوئی راستہ نکال لیں۔ فیروز میں یا اُس کے خاندان میں اتنی ہمت اور جرأت نہیں کہ اِس چوہدری پر ہاتھ اُٹھاتے۔"

"زخمی بِلّی کی مثال نہیں سُنی؟" — میں نے کہا — "شیر پر حملہ کر دیتی ہے۔"

"مَیں بتاتا ہوں ملک صاحب!" — اُس نے کہا — "دو باتیں آپ کے غور کرنے کی ہیں۔ ایک یہ کہ دو مہینے ہوتے فیروز گاؤں سے غائب ہے، یعنی نسیم کی شادی چوہدری کے ساتھ ہوئی تو دو مہینوں بعد فیروز گاؤں سے لاپتہ ہو گیا۔ کوئی کہتا ہے کہ نسیم کے ساتھ اُس کی محبت تھی اور اس صدمے کی وجہ سے کہیں چلا گیا ہے کہ نسیم پر کسی اور کا قبضہ ہو گیا ہے۔ یہ بھی سُنا ہے کہ وہ اپنے تایا کے مربعوں پر چلا گیا ہے۔ یہ مربعے منٹگمری (موجودہ ساہی وال) کے علاقے میں ہیں ....

"دوسری بات سے ایک شک پیدا ہوتا ہے۔ فیروز کا بڑا بھائی ٹینک رجمنٹ میں دفعدار ہے۔ آج کل اُس کی رجمنٹ یہاں سے نو دس میل دُور جنگی مشقوں پر آئی ہے۔ وہ گزشتہ رات گھر آیا تھا اور صبح واپس گیا تھا۔"

"تم نے دیکھا تھا؟"

"دیکھا ہی نہیں" — اُس نے جواب دیا — "مجھے ملا بھی تھا۔ وردی میں تھا۔ میں نے پوچھا کہ چھٹی آئے ہو تو کہنے لگا کہ رات کو اپنے رسالدار سے کہہ کر کھسک آیا تھا۔ آج میری ڈیوٹی آگے جانے کی نہیں۔ اب واپس جا رہا ہوں۔"

ان کی شادی ہو سکتی تھی

"یہ دفعدار کیسا آدمی ہے؟" — میں نے پوچھا۔

"دلیر آدمی ہے" — اُس نے جواب دیا — "غصے والا بھی ہے۔ لڑنے میں شیر ہے۔ دشمنوں کے سر کھول دینے والا آدمی ہے۔"

اس مخبر نے دفعدار کے تین چار کارنامے سنائے۔ یہ گاؤں میں لڑائیوں کے واقعات تھے۔ گاؤں اور اردگرد کے بدمعاش بھی اس کے آگے دب جاتے تھے۔ میں نے یہ داستان توجہ سے سُنی لیکن سوچنے والا مسئلہ یہ تھا کہ مقتول کی دفعدار کے ساتھ کیا دشمنی تھی۔

میں نے اُس کے باپ کو بلایا۔ میں دفعدار کے چھوٹے بھائی فیروز کے متعلق پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ یہ پوچھنا اس لئے ضروری تھا کہ مقتول کی نوجوان بیوی کے ساتھ اُس کا تعلق تھا۔ اُس کا باپ آ گیا۔ لباس اور چال ڈھال سے معزز اور کچھ پڑھا لکھا لگتا تھا۔ اُس کے چہرے پر گھبراہٹ بڑی صاف تھی۔

"ایک بات غور سے سُن لو چوہدری!" — میں نے اُسے بٹھا کر

کہا — "سچ بولنا ورنہ لمبے چکر میں پڑ جاؤ گے۔ تم ملزم نہیں ہو اور مشتبہ بھی نہیں ہو۔ میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ وہ بالکل سچ بتا دینا .... تمہارا بیٹا فیروز کہاں ہے؟"

"میرے بڑے بھائی کے مربعوں پر گیا ہوا ہے" — اُس نے جواب دیا اور ساہی وال کے ایک چک کا نام لیا۔

"کب سے؟"

"تقریباً دو مہینے ہو گئے ہیں" — اُس نے جواب دیا اور اپنے گاؤں سے بارہ تیرہ میل دُور کے ایک گاؤں کا نام لے کر کہنے لگا — "سُنا ہے تین چار دنوں سے وہاں آیا ہوا ہے۔ وہ اس کی ماں کا گاؤں ہے۔"

"کس سے سُنا ہے؟"

"میرے بڑے بیٹے نے بتایا تھا" — اُس نے کہا — "بڑا بیٹا فوج میں دفعدار ہے۔ دونوں بھائی کہیں ملے تھے۔"

میں نے اُس کے بیٹے فیروز کے متعلق کئی اور باتیں کیں اور اُس سے باتیں اگلوائیں۔ ان سے مجھے شک ہوا کہ فیروز کو گاؤں سے غائب کیا گیا ہے۔ میں نے اُس کے باپ سے پوچھا۔

"سچی بات زبان پر لاتے ڈرتا ہوں جناب!" — اُس نے کہا — "لیکن چُپ بھی نہیں رہا جاتا۔ بات یہ ہے کہ فیروز نسیم کے گھر جاتا رہتا تھا۔ وہ ہمارے رشتہ دار ہیں۔ سچی بات ہے کہ فیروز اور نسیم ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ ان کی شادی ہو سکتی تھی لیکن چوہدری شاہباز (مقتول) نے نسیم پر نظر رکھ لی اور نسیم کے باپ کو کھلانا پلانا شروع کر دیا۔ وہ نسیم کے گھر روزانہ جاتا اور گھنٹہ دو گھنٹے وہاں گزارتا تھا۔ سارے گاؤں میں مشہور ہو گیا کہ چوہدری نسیم کو حاصل کرنے کے لئے اُس کے ماں باپ پر روپیہ پیسہ نچھاور کر رہا ہے ....

"فیروز نے نسیم کے گھر جانا چھوڑا۔ یہ تو فیروز ہی بتا سکتا ہے کہ وہ نسیم سے کہیں باہر بھی ملتا رہا ہے یا نہیں۔ بات یہ ہے کہ چوہدری

شاہباز کو ان کا ملنا جُلنا پسند نہیں تھا۔ اب تو نسیم چوہدری شاہباز کی بیوی تھی۔ اُسے شاید پتہ چل گیا ہو گا کہ نسیم اور فیروز ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ ایک روز فیروز آیا تو اُس نے مجھے بتایا کہ وہ کھیتوں میں گھوم پھر رہا تھا کہ بالا اور رشیدو آ گئے۔ یہ دونوں بہت بڑے بدمعاش ہیں اور دونوں چوہدری شاہباز کے گھر کے یار ہیں۔"

میں ان دونوں کو جانتا تھا۔ یہی وہ بدمعاش تھے جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ فیروز کے باپ کا کچھ بیان میں اپنے الفاظ میں سناتا ہوں تاکہ مختصر ہو جائے۔ فیروز نے اپنے باپ کو بتایا کہ ان دو بدمعاشوں نے اسے کھیتوں میں روک لیا اور کہا اگر وہ پھر کبھی نسیم کے گھر گیا یا اُسے کہیں ملا تو اُسے اس طرح قتل کر دیا جائے گا کہ اُس کی لاش بھی نہیں ملے گی۔

فیروز نے اسے محض دھمکی سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ اُسے باپ نے نسیم کے گھر جانے یا اُسے کہیں اور ملنے سے سختی سے منع کر دیا۔ دوسرے ہی دن فیروز چوہدری شاہباز (مقتول) کے گھر کے سامنے سے گزرا۔ پیچھے پیچھے مقتول چلا آ رہا تھا۔ اُس نے فیروز کو آواز دے کر روک لیا۔

"تم باز نہیں آؤ گے؟" — مقتول نے فیروز سے کہا اور گالیاں بھی دیں۔ کہنے لگا — "میرے گھر اور نسیم کے گھر کے قریب سے گزرنا بھی چھوڑ دو۔"

باپ کے بیان کے مطابق فیروز نے مقتول کو تُرکی بہ تُرکی جواب دیا۔ مقتول نے اُسے کہا کہ وہ اُسے گاؤں میں نہیں رہنے دے گا۔ اسی شام بالے اور رشیدو نے فیروز کو دھوکے سے گاؤں سے باہر بلایا اور اُسے مارا پیٹا۔ فیروز نے اپنے باپ کو بتایا تو باپ نے یہ فیصلہ بہتر سمجھا کہ فیروز گاؤں سے کچھ عرصے کے لئے غیر حاضر ہو جائے۔ باپ کو ڈر تھا کہ مقتول فیروز کو مروا دے گا یا غائب کرا دے گا۔

"ایک روز چوہدری شاہباز نے مجھے دھمکی دے دی" — فیروز کے باپ نے اپنے بیان میں کہا — "مجھے گھر سے بلا کر کہنے لگا کہ تمہارے دو بیٹے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے پاس ایک ہی بیٹا رہ جائے۔ تمہارا فیروز جس لڑکی کے پیچھے لگا ہوا ہے وہ میری بیوی ہے .... میں چوہدری شاہباز کے مقابلے میں کیا تھا۔ میں نے اُس کی منت کی کہ میں فیروز کو سمجھا لوں گا۔ چوہدری نے میری نہ سُنی اور غصے میں کہا کہ تمہارا یہ بیٹا حلالی معلوم نہیں ہوتا۔ اُس نے میرے ساتھ بدتمیزی کی ہے۔ میرے آگے زبان کھولی ہے .... جنابِ عالی! میں نے اُس کے ساتھ بحث نہ کی۔ گھر جا کر اپنی بیوی کو بتایا اور ہم دونوں نے فیروز کو اگلے ہی روز اُس کے تایا کے مربعوں پہ بھیج دیا اور اُسے کہا کہ تایا کو بتا دے کہ اُسے کیوں بھیجا جا رہا ہے۔"

"تم نے بتایا ہے کہ فیروز دو تین دنوں سے اپنے ننھیال گاؤں آیا ہوا ہے" — میں نے کہا اور ایک شک کی بنا پر پوچھا — "کیا وہ یہاں بھی آیا تھا؟"

وہ فوراً جواب دینے کی بجائے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میرا شک پختہ ہو گیا۔

"جھوٹ بولنے کی نہ سوچنا" — میں نے کہا — "وہ یہاں آیا تھا۔ رات کو آیا اور صبح ہونے سے پہلے چلا گیا تھا۔"

"میں جھوٹ بولنے کی نہیں سوچ رہا تھا جنابِ عالی!" — اُس نے مرعوب سی آواز میں کہا — "میں اِس ڈر سے چُپ ہو گیا تھا کہ بتا دیا کہ فیروز آیا تھا تو آپ اُسے شک میں گرفتار کر لیں گے کہ چوہدری شاہباز کو اُسی نے قتل کیا ہے .... وہ آیا تھا اور ہمیں مل کر چلا گیا ہے۔"

نوجوان بیوی نے خبر پہنچائی ہو گی

"رات کو وہ آیا" ـــــ میں نے کہا ـــــ "اور اُسی رات کو ہی تمہلا بڑا بیٹا آگیا جو فوج میں دفعدار ہے۔ صبح ہونے سے پہلے فیروز گیا اور صبح ہونے کے بعد اُس کا بڑا بھائی گیا۔"

اُس کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ رات آدھی سے کچھ زیادہ گزر گئی تھی۔ لالٹین کی روشنی میں مجھے اُس کے چہرے کا بدلتا ہُوا رنگ اس طرح نظر آیا جیسے اس شخص کے جسم سے خون ختم ہو رہا ہو۔ مقتول ان دونوں بھائیوں کے جانے کے بعد قتل ہُوا تھا۔ میں نے اُن کے باپ کو مزید پریشانی سے بچانے کے لئے اُسے تسلی دی کہ وہ نہ گھبرائے۔

"تمہارے بیٹوں پر شک نہیں ہو سکتا" ـــــ میں نے آخر میں اُسے کہا ـــــ "اگر وہ اتنے دلیر ہوتے تو دو مہینے انتظار نہ کرتے" ـــــ میں نے اُس سے پوچھا ـــــ "تمہارا دفعدار بیٹا اس سے پہلے کب چھٹی آیا تھا؟"

"سات آٹھ مہینے ہو گئے ہیں" ـــــ اُس نے جواب دیا۔

میرا شک یقین میں بدلنے لگا۔ میرے خیال کے مطابق یُوں ہُوا تھا کہ دفعدار کو چھوٹا بھائی ملنے گیا تھا۔ اُس نے بڑے بھائی کو بتایا کہ مقتول نے اُس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ بڑے بھائی (دفعدار) کے متعلق مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ غصے والا دلیر آدمی ہے اور بدمعاش بھی اُس سے دبکتے ہیں۔ اُس نے اپنے چھوٹے بھائی کو یہ رات بتاتی کہ گاؤں میں آجاتے۔ چھوٹا بھائی آیا اور کلہاڑی اور برچھی لے کر صبح طلوع ہونے سے پہلے گھر سے نکل گیا۔ کلہاڑی اور برچھی وہ ساتھ لے گیا۔ دونوں نے مقتول کا راستہ روک کر اُسے قتل کیا۔ دفعدار اپنی رجمنٹ میں چلا گیا جو وہاں سے زیادہ دُور نہیں تھی اور فیروز اپنے ننھیال چلا گیا۔ یہ گاؤں بھی دُور نہیں تھا۔

اب سوال یہ رہ گیا تھا کہ انہیں کس نے بتایا تھا کہ مقتول فلاں

گاؤں گیا ہُوا ہے اور فلاں وقت واپس آ رہا ہے .... میرا دھیان فوراً مقتول کی نوجوان بیوی نسیم کی طرف گیا۔ اُس نے یہ خبر فیروز تک پہنچائی ہو گی۔

میں نے فیروز اور دفعدار کے باپ کو باہر بٹھا دیا میں ان بھائیوں کے خلاف شہادت اکٹھی کرنا چاہتا تھا۔ نمبردار کو بلایا اور اُسے کہا کہ باہلے اور رشید کو جگا کر لے آتے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ آگئی تھی اور ماتم ہو رہا تھا۔ چوہدری شاہباز کا قتل گاؤں والوں کے لئے غیر معمولی واقعہ تھا۔ پوسٹمارٹم میں کلہاڑیوں اور برچھیوں کے زخم لکھے گئے تھے اور موت کا وقت صبح دس بجے کے لگ بھگ بتایا گیا تھا۔

مجھے بتایا گیا کہ مقتول اپنے جن دوستوں کے پاس اُن کے گاؤں گیا تھا، وہ آ گئے ہیں۔ میں نے ایک کانسٹیبل کو بلا کر کہا کہ سائیکل یا گھوڑے پر تھانے جاتے اور اے ایس آئی کو ساتھ لے آتے۔ میں نے بہتر سمجھا کہ مقتول کی نئی بیوی سے پوچھ گچھ کی جاتے۔ چنانچہ اُسے بلا لیا۔ وہ میرے سامنے آئی تو مجھے اندازہ ہُوا کہ صحیح معنوں میں خوبصورت لڑکی ہے۔ میں نے دونوں بیویوں بلکہ بیواؤں میں یہ فرق دیکھا کہ پرانی بیوی کی آنکھیں رو رو کر سُوجی ہوئی تھیں اور ناک سُرخ تھی لیکن نئی بیوی کی آنکھیں خشک تھیں۔ اگر اس نے آنسو بہاتے تھے تو وہ خوشی کے آنسو ہوں گے۔

"چھوٹی چوہدرانی!" ـــــ میں نے اُسے کہا ـــــ "مجھے تھانیدار سمجھ کر ڈر نہ جانا۔ میرے دل میں تمہاری ہمدردی ہے۔ مجھے احساس ہے کہ تمہارے ساتھ ظلم ہُوا ہے۔ ظلم بھی دوہرا ہُوا ہے۔ ایک تو تمہیں فیروز سے چھینا گیا اور دوسرا یہ کہ تمہیں اپنی عمر سے دُگنی عمر کے آدمی کے ساتھ بیاہ دیا گیا۔"

میں نے نوٹ کیا کہ فیروز کے نام پر اُس نے چونک کر میرے مُنہ کی طرف دیکھا۔ میں اُس کے ساتھ ہمدردی کی باتیں کرتا رہا جن سے اُس کے چہرے کا کھچاؤ کم ہوتا گیا۔

"یہ تو میری قسمت اچھی تھی کہ بڑی چوہدرانی نیک اور اچھے اخلاق والی تھی"۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "اگر ایسی نہ ہوتی تو میں دوزخ کی آگ میں جلتی رہتی۔ ایک زبردستی کی شادی، دوسرے خاوند باپ کی عمر کا اور تیسرے سوکن۔ میں تو اس سوکن سے ڈرتی تھی کہ یہ مجھ سے گن گن کر بدلے لے گی۔ چوہدری کا سلوک بھی اچھا رہا لیکن .... لیکن ...."

دو مرتبہ لیکن کہہ کر اُس نے سر جھکا لیا۔ میں جانتا تھا وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔

"لیکن تم جو خواب دیکھ رہی تھیں وہ پورا نہ ہُوا"۔۔۔ میں نے ایسی عورت کے لہجے میں کہا جو مایوس اور مجبور ہُوا کرتی ہے ۔۔۔ "فیروز کے والدین کو چاہیئے تھا کہ اُس کے لئے تمہارا رشتہ جلدی لے لیتے .... مجھے غصہ تمہارے ماں باپ پر آتا ہے۔ روپے پیسے کے لالچ میں آکر تم جیسی خوبصورت اور سُگھڑ لڑکی کو اتنی زیادہ عمر کے آدمی کے حوالے کر دیا۔"

"ماں بے چاری کا کوئی قصور نہیں"۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "میرا باپ لالچی ہے۔ چوہدری کی بجائے میرے باپ کو کوئی قتل کر دیتا تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی۔"

وہ میرے ساتھ یوں باتیں کرنے لگی جیسے میں اُس کی ہمراز اور ہمدرد سہیلی تھی۔ میں اُسے اسی مقام پر لانا چاہتا تھا۔ میں اُسے آہستہ آہستہ اپنے کام کی باتوں کی طرف لانے لگا۔

وہ فیروز کے گھر چلی گئی

"تمہارا کیا خیال ہے"۔۔۔ مَیں نے اُس سے پوچھا ۔۔۔ "چوہدری کا قاتل کون ہو سکتا ہے؟"

"کچھ سمجھ نہیں آتی"۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "بڑی چوہدرانی سے پوچھا تو وہ بھی یہی کہتی ہے کہ چوہدری کا ایسا دشمن کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے

تو یہاں تک سوچا ہے کہ یہ کام فیروز ہی نہ کر گیا ہو لیکن وہ تو یہاں ہے ہی نہیں .... یہ بات بھی سوچ میں آئی کہ فیروز کو کیسے پتہ چل سکتا تھا کہ چوہدری فلاں گاؤں گیا ہُوا ہے اور فلاں وقت واپس آئے گا۔"

"یہ تو کسی کو بھی معلوم نہیں تھا"۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "یہ صرف تمہیں اور بڑی چوہدرانی کو معلوم تھا۔"

"ہم دونوں کو تو وہ بتا کر گیا تھا"۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "ہم اُس کا انتظار کر رہی تھیں لیکن اُس کی خالی گھوڑی واپس آ گئی۔"

میں اُس سے معلوم کرنا چاہتا تھا کہ فیروز رات کو یہاں آیا تھا تو کیا وہ اُس سے ملی تھی؟ مجھے شک تھا کہ وہ فیروز سے ملی تھی اور اُسے بتایا تھا کہ مقتول فلاں وقت فلاں گاؤں سے واپس آرہا ہے، لیکن میں یہ سوال اُسے کچھ چکر دے کر پوچھنا بہتر سمجھتا تھا۔ یہ کام اُستادی کا تھا۔ میں نے اُسے دوسری باتوں میں لگا لیا۔ یہ باتیں اُس کی ازدواجی زندگی کے متعلق تھیں۔ اُس نے پرانی بیوی کے بیان کی تصدیق کر دی کہ ان دونوں سوکنوں کا آپس میں سلوک نہایت اچھا تھا۔

"پھر بھی نسیم!"۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "تمہارے اور فیروز کے دِلوں سے ایک دوسرے کی محبت تو نہیں نکل سکتی تھی۔ فیروز کو چوہدری نے ڈرا دھمکا کر گاؤں سے تو نکلوا دیا ہے لیکن اس خوبصورت جوان کو تمہارے دل سے تو کوئی نہیں نکال سکتا۔"

اُس کے آنسو بہہ نکلے۔ میں نے اُس کے جذبات کو ہلا دیا اور اُس نے تسلیم کر لیا کہ فیروز اور وہ عشق و محبت کی داستانوں کی طرح ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ نسیم نے کہا کہ ان کی شادی ہو سکتی تھی اس لئے انہوں نے محبت اور ملاقاتوں کو پاک رکھا ہُوا تھا۔

"چوہدری نے شادی کے بعد تم سے فیروز کے متعلق پوچھا ہو گا"۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "اُس نے پوچھا ہو گا کہ تم فیروز کو چاہتی تھیں یا نہیں۔"

"پوچھا تھا"۔۔۔ اُس نے جواب دیا ۔۔۔ "میں یہ تو نہیں کہہ سکتی تھی

کرہاں میں فیروز کو چاہتی ہوں لیکن چوہدری کو معلوم تھا۔ اُس نے مجھے پہلے روز ہی خبردار کر دیا تھا کہ تم نے فیروز کے ساتھ جس دن بات کی وہ تمہاری زندگی کا آخری دن ہو گا۔"

"میں تمہاری دلیری اور وفا کی تعریف کرتا ہوں"— میں نے ہوا میں تیر چلایا— "تم پھر بھی فیروز سے ملنے سے باز نہ آئیں۔ محبت ہو تو ایسی ہو۔ فیروز کل رات گھر آیا تھا اور تم اُس کے گھر پہنچ گئیں۔"

یہ میرا شک تھا لیکن میں نے اسے ایسے انداز سے کہا جیسے مجھے یقین ہو۔ ہوا میں چلایا ہوا میرا تیر ضائع نہ گیا۔

"آپ کو کس نے بتایا ہے؟"— نسیم نے پوچھا۔

"میں تمہیں تمہارے متعلق ایسی باتیں بتا سکتا ہوں جو تم اپنے آپ سے بھی چھپاتی پھرتی ہو"— میں نے کہا— "میں کسی کو بتاؤں گا نہیں۔ ویسے بھی تمہیں اب نہیں ڈرنا چاہیئے۔ چوہدری مر گیا ہے۔ تم آزاد ہو....ایک بات سُن لو نسیم!"— میں نے دوستانہ لہجے میں کہا— "اگر تمہارا ہونے والا بچہ لڑکا ہُوا تو اس کا حق نہ چھوڑنا۔ یہ چوہدری کی جائیداد کا وارث ہو گا۔ وقت آنے دو۔ میں اس معاملے میں تمہاری مدد کروں گا۔"

کچھ اور باتیں ہوئیں تو اُس نے بتا دیا کہ وہ فیروز سے کس طرح ملی تھی۔ اُس رات مقتول دوسرے گاؤں گیا ہُوا تھا۔ اُس سے نسیم نے اجازت لے لی تھی کہ اپنے ماں باپ کے گھر جائے گی اور صبح واپس آئے گی۔ چوہدری صبح چلا گیا اور نسیم اپنے گھر چلی گئی۔ شام گہری ہو گئی تو فیروز کی ایک بہن نے نسیم کے گھر جا کر اُس کے کان میں بتایا کہ فیروز آیا ہے اور وہ صبح ہونے سے پہلے چلا جائے گا۔

نسیم نے اپنے اوپر کھیس لیا اور اندھیرے میں فیروز کے گھر چلی گئی۔ فیروز کا دفعدار بھائی بھی آیا ہُوا تھا۔ نسیم فیروز سے علیحدگی میں تو نہیں مل سکتی تھی۔ سب اکٹھے بیٹھے تھے۔ نسیم نے باتوں باتوں میں بتایا کہ چوہدری فلاں گاؤں گیا ہُوا ہے اور کل صبح واپس آئے گا۔

نسیم زیادہ دیر وہاں نہ بیٹھی اور واپس آ گئی۔

میں نے نسیم سے اور کچھ نہ پوچھا۔ میرا شُبہ پختہ ہو گیا تھا۔ میں نے نسیم کو جانے کی اجازت دے دی اور ان دونوں بھائیوں کو شاملِ تفتیش کر کے تھانے میں طلب کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ پہلی کارروائی یہ کرنی تھی کہ فیروز کے ننھیال جا کر خانہ تلاشی لینی تھی۔ میں پہلے سُنا چکا ہوں کہ موقعۂ واردات سے برچھی کی اَنی ملی تھی جو خون آلود تھی اور یہ میرے پاس تھی۔ میں نے اس کا دستہ جو چھ فٹ یا اس سے لمبا ہونا چاہیئے تھا، برآمد کرنا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ قاتل یہ دستہ جو اَب لاٹھی بن کے رہ گیا تھا، اپنے گھر لے گیا ہو، پھر بھی امید تھی کہ یہ اُس کے گھر سے مل جائے گا۔ کلہاڑی بھی برآمد کرنی تھی۔

ایک مشکل پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ دفعدار بغیر چھُٹی کے آیا تھا۔ یہ میرا خیال تھا۔ ایسے واقعات ہو چکے تھے کہ ایک فوجی آیا اور گاؤں میں اپنے کسی دشمن کو قتل کر کے چلا گیا۔ گاؤں میں کئی عینی شاہد تھے لیکن اُسے گرفتار کرنے کے لئے اُس کی رجمنٹ میں گئے تو وہاں سے جواب ملا کہ یہ آدمی اپنی رجمنٹ سے باہر گیا ہی نہیں اور یہ فلاں ڈیوٹی پر حاضر تھا۔ میں نے "حکایت" کے لئے سب سے پہلی جو کہانی لکھی تھی— "وہ دلیر تھا یا بیوقوف"— وہ ایسے ہی ایک فوجی کے متعلق تھی۔ اُسے اپنے افسروں نے یہ ثابت کر کے بچا لیا تھا کہ وہ گاؤں گیا ہی نہیں، وہ تو ڈیوٹی پر حاضر تھا۔ اس کے بعد بھی تین چار وارداتیں ایسی ہی ہوئی تھیں۔

فیروز کے بڑے بھائی کے معاملے میں مجھے یہی خطرہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے اسی کام کے لئے اے ایس آئی کو بلایا تھا۔

نوجوان نوکرانی اور جوان مزارعہ

مقتول اپنے جن دوستوں کے پاس اُن کے گاؤں گیا تھا، وہ میرے

بلاوے پر آتے ہوتے تھے۔ وہ معزز آدمی تھے۔ بہت دیر سے آتے ہوتے تھے۔ میں نے ان دونوں کو اندر بلا کر بٹھایا اور ان سے پوچھا کہ مقتول کی ان کے ساتھ دوستی کیسی تھی؟ انہوں نے بتایا کہ بہت گہری دوستی تھی اور کبھی وہ چوہدری کے ہاں آیا کرتے اور کبھی چوہدری ان کے ہاں جایا کرتا تھا۔

"اُس کی کسی کے ساتھ ذاتی دُشمنی تھی؟" — میں نے پوچھا — "کبھی اُس نے تمہیں بتایا ہوگا۔"

"اُس نے ہمارے ساتھ کبھی کسی دشمنی کا ذکر نہیں کیا تھا" — ان میں سے ایک نے جواب دیا۔

"جس طرح چوہدری قتل ہُوا ہے" — دوسرے نے کہا — "اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا یہ دشمن کوئی بڑا ہی ظالم تھا۔ اُس نے قصائیوں کی طرح انتقام لیا ہے۔"

"کیا چوہدری ایسا آدمی تھا کہ اُس نے تمہارے گاؤں سے واپس آتے ہوتے راستے میں کسی عورت کو چھیڑا ہو اور اس عورت کے آدمیوں نے انتقام لیا ہو؟" — میں نے پوچھا۔

"چوہدری اتنا نیچ آدمی نہیں تھا" — اُس کے ایک دوست نے جواب دیا۔

"انہیں اُس مزارعے کی بات بتا دیتے ہیں" — دوسرے نے کہا۔

"بتا دو" — پہلے نے کہا — "یہ کوئی دُشمنی والی بات نہیں۔"

اُنہوں نے بات یہ بتائی کہ مقتول کی ایک نوکرانی ہے جو خاصی خوبصورت اور نوجوان ہے۔ مقتول کے ان دوستوں کے ایک گاؤں کا آدمی ہے جو وہاں ایک بڑے زمیندار کا مزارعہ ہے۔ اس مزارعہ کا آنا جانا مقتول کے گاؤں رہتا تھا۔ بتایا گیا کہ اس مزارعہ کی مقتول کی نوکرانی کے ساتھ درپردہ دوستی تھی یا مقتول کو ایسی دوستی کا شک تھا۔ ایک روز مقتول نے ان دونوں کو کہیں دیکھ لیا اور اس مزارعہ کی پٹائی کر دی۔ مزارعہ نے اپنے

زمیندار کو بتایا اور زمیندار نے ناراضگی کا اظہار کیا تھا۔

میں نے اُن سے پوچھا کہ اس زمیندار کی ایسی دشمنی تو مقتول کے ساتھ نہیں ہوتی تھی کہ وہ اسے قتل کرا دیتا۔ مجھے جواب ملا کہ ایسی دشمنی معلوم نہیں ہوتی تھی۔

میں جلدی میں تھا اور میری سو فیصد توجہ فیروز اور اُس کے بڑے بھائی پر تھی اور چونکہ شکوک اور واقعاتی شہادت کی بناء پر یہی ملزم نظر آتے تھے اس لئے میں نے مقتول کے ان دوستوں کی طرف توجہ نہ دی۔ انہوں نے جو بات بتائی تھی یہ ایسی دشمنی والی بات نہیں تھی جو اتنے ظالمانہ قتل تک پہنچتی۔ میں نے مقتول کے دونوں دوستوں کو جانے کی اجازت دے دی۔

اے ایس آئی آ گیا تھا۔ میں نے اُسے سارا کیس سمجھایا اور بتایا کہ فلاں نمبر ٹینک رجمنٹ کا ایک دفعدار ہے۔ اُسے شاملِ تفتیش کرنا ہے۔ اے ایس آئی سیدھا اس ٹینک رجمنٹ میں نہیں جا سکتا تھا۔ اس کے لئے پولیس کے بالائی افسروں کی چٹھی کی ضرورت تھی۔ اے ایس آئی پرانا اور تجربہ کار آدمی تھا۔ اُسے اس طریقۂ کار کا اچھی طرح علم تھا۔ وہ میری پوری بات سُن کر اور سمجھ کر چلا گیا۔

میں وہیں سے اپنے عملے کو اور فیروز کے باپ کو ساتھ لے کر فیروز کے ننھیال کو روانہ ہو گیا۔ وہاں تک پہنچتے کم و بیش دو گھنٹے لگ گئے۔

فیروز کے باپ کی راہنمائی میں میں فیروز کے ننھیال کے گھر پہنچا۔ اُس کے باپ نے بتایا کہ یہ فیروز ہے۔ فیروز واقعی خوبصورت جوان تھا۔ میں نے اُسے الگ کر لیا۔

"ڈرنا اور گھبرانا نہیں فیروز!" — میں نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا — "چوہدری شاہباز کے قتل کا مجھے کوئی افسوس نہیں ..."

"چوہدری شاہباز؟" — فیروز نے حیرت سے آنکھیں بہت زیادہ کھول کر پوچھا — "کون سا چوہدری شاہباز؟ ... کیا وہ قتل ہو گیا ہے؟"

میں اُس کی اس بات پر حیران ہُوا۔ میں اس کے [illegible]ے کو

پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن مجھے ابھی کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔

"اتنا زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کرو فیروز!" — میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا — "تم نے میری پوری بات نہیں سُنی۔ میں کہہ رہا تھا کہ اِس بدکار چوہدری کے قتل کا مجھے کوئی افسوس نہیں۔ میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

"میری آپ کیا مدد کریں گے؟" — فیروز نے پوچھا — "وہ اگر قتل ہو گیا ہے تو میں اپنے گاؤں جا سکوں گا۔ اُس کی غنڈہ گردی کی وجہ سے میں گاؤں سے نکلا ہوا ہوں۔ میرا خاندان اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔"

"میری بات سمجھنے کی کوشش کرو فیروز!" — میں نے کہا — "میں تمہارے ساتھ سیدھی بات کرتا ہوں۔ میں تمہارے نانا کے گھر کی تلاشی لینے آیا ہوں۔ میں تمہارے ننھیال کی عزّت قائم رکھنا چاہتا ہوں۔ تم کلہاڑی اور برچھی خود ہی نکال کر میرے حوالے کر دو۔"

"کونسی کلہاڑی؟" — اُس نے حیران ہو کر پوچھا — "کونسی برچھی؟ .... معلوم ہوتا ہے کہ چوہدری خود تو قتل ہو گیا ہے، لیکن اپنے بچھلوں کو میرے پیچھے ڈال گیا ہے۔"

یہ جوان آدمی خاصا ذہین معلوم ہوتا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ یہ چالاک اور ہوشیار بھی ہے یا نہیں۔ میں نے خانہ تلاشی سے پہلے اُس سے پوچھ گچھ بہتر سمجھی۔ اُس سے پوچھا کہ وہ قتل سے ایک رات پہلے گاؤں گیا تھا۔ اُس نے بلاجھجک جواب دیا کہ وہ گیا تھا۔

"اپنے گاؤں جانے کی مجھ پر سرکاری پابندی تو نہیں" — اُس نے کہا — "پابندی صرف یہ ہے کہ میں چوہدری شاہباز کے ڈر سے گاؤں نہیں جاتا .... میں آپ کو یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ میرا بڑا بھائی جو فوج میں دفعدار ہے آیا ہوا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ آئے گا۔ میں کچھ دن پہلے اُسے ملنے گیا تھا۔ اُس نے بتایا تھا کہ وہ فلاں رات گاؤں جاتے گا۔"

میں نے اُس سے جتنی باتیں پوچھیں وہ اُس نے بالکل ٹھیک بتا دیں بلکہ ایک دو فالتو باتیں بھی بتائیں۔ اُس کا انداز بتا رہا تھا جیسے وہ مجھے گمراہ نہیں کر رہا بلکہ میری معلومات میں اضافہ کر رہا ہے۔ اُس نے نسیم کے متعلق بھی جتنی باتیں بتائیں وہ بالکل وہی تھیں جو میں پہلے سُن چکا تھا۔ اُس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اُس کے دفعدار بھائی نے مقتول کے بدمعاش دوستوں، بالے اور رشید کو بہت ڈرایا دھمکایا تھا کہ انہوں نے مجھے مارا پیٹا تھا۔

"آپ کو شک ہے کہ میں نے چوہدری شاہباز کو قتل کیا ہے" — فیروز نے کہا — "اگر مجھ میں یا میرے بھائی میں یا میرے خاندان کے کسی بھی آدمی میں اتنی ہمّت ہوتی تو میں گاؤں سے کیوں بھاگتا؟ مجھے میرے بڑے بھائی نے کہا ہے کہ میں کچھ دن اور اپنے گاؤں سے دُور رہوں اور میرا بڑا بھائی جو فوج میں ہے، اپنے کمانڈنگ آفیسر کو چوہدری شاہباز کے خلاف درخواست دے گا کہ وہ ہمارے خاندان کو خود بھی تنگ کرتا ہے اور اپنے پالے ہوئے بدمعاشوں کے ذریعے بھی تنگ کرواتا ہے۔"

میں نے اپنی اُستادی، تجربے اور ٹریننگ کو پوری طرح استعمال کیا لیکن فیروز پر میری کوئی بھی چال کارگر نہ ہوئی۔ میں نے خانہ تلاشی لی۔ یہ کاشتکاروں کا گھر تھا اس لئے وہاں کلہاڑیاں بھی تھیں لیکن مجھے اپنے مطلب کی کوئی چیز نہ ملی۔

بے نکاحی بیوی بنا لیا

"کیا آپ چوہدری شاہباز کو شریف آدمی سمجھتے تھے؟" — فیروز نے کہا — "اُس نے تو اپنی نوکرانی کو بے نکاحی بیوی بنا کر رکھا ہوا تھا۔ یہ کوئی راز نہیں۔ چوہدری کی پہلی بیوی کو بھی معلوم ہے اور دوسری کو بھی۔"

میں فیروز کو ساتھ لے کر وہاں سے چل پڑا اور مقتول کے گاؤں چلا گیا۔ فیروز نے کچھ ایسی باتیں بتائی تھیں جن کی تصدیق میں گاؤں میں بیٹھ کر کرنا بہتر سمجھتا تھا۔ نمبردار نے اپنی ڈیوڑھی میں میرے بیٹھنے کا انتظام کر دیا تھا۔ میں نے سب سے پہلے باہلے اور رشیدے کو بلایا۔ باہلا لستہ ب کا رجسٹرڈ بدمعاش تھا۔ ایسے رجسٹرڈ بدمعاش پولیس کو خوش کرنے کے لئے ہر جائز اور ناجائز کوشش کرتے ہیں تاکہ ان کے نام لستہ ب سے کٹ جائیں۔ میں نے باہلے کو اپنے پاس بٹھایا اور اُس کے متعلق تفتیش میں جو باتیں میرے سامنے آئی تھیں وہ اُس کے آگے رکھیں اور کہا کہ وہ بالکل سچ بتائے۔

اُس نے ان تمام باتوں کی تصدیق کر دی اور اُس نے تسلیم کیا کہ اُسے، رشیدے اور ایک سکھ بدمعاش کو چوہدری کھلاتا پلاتا رہتا اور پیسے بھی دیتا تھا۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ فیروز کے بڑے بھائی نے ان تینوں کو بہت ڈرایا دھمکایا تھا لیکن یہ تینوں اُس سے ڈرنے والے نہیں تھے۔

میں نے رشیدے کو بھی اندر بلا لیا اور نمبردار کو بلا کر کہا کہ ان کے تیسرے ساتھی کو بھی بلا لائے۔ کچھ دیر بعد تیسرا ساتھی بھی آگیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ مقتول کی پرائیویٹ زندگی کے متعلق یہ تینوں سب کچھ جانتے ہوں گے۔

"تم تینوں ملزم نہیں ہو" — میں نے تینوں کو اکٹھے بٹھا کر کہا — "تم جانتے ہو کہ میں چوہدری کے قتل کی تفتیش کر رہا ہوں۔ اُسے کسی دُشمن نے قتل کیا ہے۔ سب کہتے ہیں کہ اُس کا کوئی دُشمن نہیں تھا۔ وہ تمہارا یار تھا۔ تم جانتے ہو گے کہ ذاتی طور پر اُس کا کوئی دُشمن تھا۔ اگر تم نہیں بتا سکتے تو میں سمجھوں گا کہ تم تینوں اُس کے دشمن ہو۔ کسی وجہ سے تمہارے ساتھ دُشمنی ہو گئی اور تم نے اُسے قتل کر دیا۔"

"ہماری چوہدری کے ساتھ کوئی دُشمنی نہیں تھی جناب!" — باہلے نے کہا — "ہمارا تو وہ روزی رسان تھا۔ ہمارے سروں پر ہاتھ رکھتا تھا۔ میں آپ کو ایک بات بتاتا ہوں جو میرے ان دوستوں کو بھی معلوم ہے۔

اس گاؤں میں چوہدری شاہباز کا کوئی دُشمن نہیں تھا۔ اگر کوئی تھا تو دشمنی اتنی سخت نہیں تھی کہ اُسے اس طرح قتل کیا جاتا۔"

"دفعدار اور اُس کے بھائی فیروز کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟" — میں نے پوچھا۔

"اوہ نہیں بادشاہو!" — مجھے آج تک یاد ہے، یہ باہلے کا جواب تھا۔ رشیدا اور خوشیا (ان کا سکھ ساتھی) طنزیہ ہنس پڑے۔

"ان میں اتنا دم ہوتا تو فیروزا گاؤں سے نہ بھاگتا" — رشیدے نے کہا۔

"دو مہینے سے اوپر دن ہو گئے ہیں فیروزے کو گاؤں سے نکلے ہوئے" — خوشیا بولا — "اُس نے اپنے بھائی کے ساتھ مل کر اپنی بےعزتی کا انتقام لینا ہوتا تو دو مہینے انتظار نہ کرتے۔"

"سُنا ہے دفعدار نے تمہیں ڈرایا دھمکایا تھا" — میں نے کہا۔

"آپ نے ٹھیک سُنا ہے" — باہلے نے کہا — "لیکن آپ نے یہ نہیں سُنا ہو گا کہ ہم نے اُسے کیا جواب دیا تھا۔ وہ بدلا لینے والا ہوتا تو ہم سے لے لیتا۔ اُس کے بھائی کو تو ہم نے مارا پیٹا تھا.... یقین کریں کہ پہلے تو اُس نے ہم پر غصّہ جھاڑا، جب ہم نے اُسے غصّے کا جواب غصّے سے دیا اور کہا کہ چوہدری کے ساتھ بات کرو تو وہ ڈھیلا پڑ گیا اور منتیں کرنے لگا کہ فیروز گاؤں میں واپس آجائے تو چوہدری اُسے کچھ نہ کہے۔ ہم نے اسے کہا کہ فیروز پکا وعدہ کرے کہ وہ چوہدری کی نئی بیوی کی طرف دیکھے گا بھی نہیں تو چوہدری اُسے کچھ نہیں کہے گا اور اُس کی عزت بھی کرے گا۔ اُس نے کہا کہ وہ فیروز کو سمجھا دے گا۔"

یہ سُن کر بھی دفعدار اور فیروز پر میرا شک قائم رہا۔ وہ اس لئے کہ دفعدار چالاک آدمی ہو گا۔ اُس نے یہ تاثر دینے کے لئے کہ وہ مقتول سے ڈرتا ہے، اُس نے ان بدمعاشوں کے آگے منت سماجت کی ہو گی کہ چوہدری اُس کے بھائی کو گاؤں میں آنے کی اجازت دے دے۔ بہرحال میں نے باہلے سے کہا کہ وہ جو بات مجھے سنانے لگا تھا وہ سنائے۔

"میں چوہدری کے ایک دشمن کی نشاندہی کرنے لگا تھا"— بالے نے کہا —"میں آپ کو ساری بات سنا دیتا ہوں۔ آپ خود سوچ لیں کہ یہ دُشمنی والی بات بنتی ہے یا نہیں .... چوہدری کی ایک نوکرانی ہے جس کی عمر اٹھارہ اُنیس سال ہے۔ یہ چھ سات سال کی بچی تو اس کا باپ مر گیا۔ وہ چوہدری کا کے مویشیوں کو سنبھالتا تھا۔ بچی کی ماں اچھی شکل والی تھی۔ بچی دس بارہ سال کی ہوتی تو اس کی ماں بھی مر گئی۔ بچی اکیلی رہ گئی۔ چوہدری نے بچی کو اپنے گھر ہی رکھا۔ اچھا کھانے اور پہننے کو ملا تو بچی کا رنگ روپ نکھر آیا۔ نقش ماں کی طرح اچھے تھے۔ آپ نے دیکھا ہے کہ چوہدری کی پرانی بیوی کی شکل وصورت ایسی ویسی ہی ہے۔ بچی جوان ہوتی تو بہت خوبصورت نکلی۔ چوہدری نے اسے اس طرح درپردہ بے نکاحی بیوی یا داشتہ بنا لیا کہ ہم تینوں کے سوا کسی کو یہ راز معلوم نہیں۔ چوہدری کی پرانی بیوی کو بھی معلوم نہیں ....

"چوہدری جس گاؤں سے واپس آتا مارا گیا ہے، وہاں کے ایک جوان مزارعہ کے قریبی رشتہ دار ہمارے گاؤں میں رہتے ہیں۔ وہ بڑا خوبصورت جوان ہے۔ کبڈی میں اُس نے بڑا نام پیدا کیا ہے۔ خدا نے اُسے آواز اتنی سُریلی دی ہے کہ گاتا ہے تو راہ چلتے لوگ رُک جاتے ہیں۔ وہ ہمارے گاؤں میں آتا رہتا تھا۔ چوہدری کی نوکرانی کی اُس کے ساتھ کہیں ملاقات ہو گئی۔ ان کا پیار محبت والا معاملہ چل پڑا ....

"ایک روز چوہدری نے ہم تینوں کو گھر بلا کر کہا کہ وہ کھیتوں کی طرف گیا تو اُس نے اپنی نوکرانی کو اس مزارعہ کے ساتھ دیکھ لیا۔ چوہدری نے نوکرانی کو وہیں مارا پیٹا اور دو تین تھپڑ مزارعہ کو بھی لگا دئیے۔ وہ مزارعہ تھا اس لئے اُس نے تھپڑ کھا لئے ورنہ چوہدری کو وہ کیا سمجھتا تھا۔ ہڈی پسلی ایک کر دیتا۔ گھر آکر چوہدری نے نوکرانی کو اور زیادہ مارا پیٹا ....

"چوہدری نے ہمیں کہا کہ یہ مزارعہ کبھی اس گاؤں میں آئے تو اسے مار پیٹ کر گاؤں سے نکال دو .... ہم اسے اچھی طرح جانتے تھے۔

وہ تیسرے چوتھے دن خوشیے کو گاؤں میں نظر آ گیا۔ خوشیے نے مجھے بتایا۔ ہم دونوں نے اُسے کہا کہ اُس کی خیریت اِسی میں ہے کہ گاؤں سے فوراً نکل جائے۔ یہ چوہدری شہباز کا حکم ہے ....

اب چلی جاؤں گی

"مزارعہ نے کہا کہ وہ اپنے رشتہ داروں کے گھر آیا ہے اور انہیں مل کر واپس جا رہا ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ آئندہ اس گاؤں میں نہ آئے۔ اُس نے مُسکرا کر کہا کہ میں تو اس گاؤں میں آتا ہی رہوں گا، تمہارا چوہدری اس گاؤں سے ہمیشہ کے لئے چلا جائے گا۔ اُس نے گُلّی (نوکرانی) کو مارا پیٹا ہے، اس کی اُسے قیمت دینی پڑے گی۔"

"یہ کب کی بات ہے؟"— میں نے پوچھا۔

"قتل کے دن سے چار یا پانچ روز پہلے کی"— بالے نے جواب دیا —"چوہدری قتل سے ایک روز پہلے اُسی گاؤں کو چل پڑا۔ وہاں اُس کے دو دوست ہیں۔ میں نے اور رشیدے نے اُسے کہا کہ وہ ذرا ہوشیار ہو کے جائے۔ چوہدری نے ہنس کر کہا کہ ان نیچ ذاتوں کی کیا مجال ہے کہ ہمارے سامنے آنکھ بھی اُٹھا سکیں۔"

میں نے اِس مزارعہ کے متعلق اِن تینوں سے تبادلہ خیالات کیا۔ ان کی رائے یہ تھی کہ یہ مزارعہ مزاج کا بڑا تیز ہے اور یہ اپنے آپ کو نیچ ذات نہیں سمجھتا۔

"میں اُس گھر کے کسی ایسے آدمی سے ملنا چاہتا ہوں جو ذرا عقل والا ہو"— میں نے کہا —"میرا مطلب اُس گھر سے ہے جہاں وہ آیا کرتا ہے۔"

"ہاں حضور!"— خوشیا بولا —"میں آپ کے مطلب کا آدمی لے آؤں گا۔"

میں نے خوشیا کو اُسی وقت ایک آدمی کو اپنے ساتھ لانے کے

لئے بھیج دیا اور نمبردار کو بلا کر کہا کہ مقتول کی نوکرانی کو ساتھ لے آئے۔

پہلے نوکرانی آئی۔ وہ نسیم جیسی حسین لڑکی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ نسیم چوہدرانی اور یہ لڑکی نوکرانی تھی۔ میں نے باہلے وغیرہ کو باہر نکال دیا اور نوکرانی کو تسلیاں دلاسے دے کر اُس کی گھبراہٹ ختم کی، پھر اُس سے پوچھا کہ مقتول کے ساتھ اُس کے تعلقات کیسے تھے۔ میں نے اُسے یقین دلایا کہ اُس پر کوئی الزام نہیں۔

"اور میں تمہیں ایک اور بات بتا دیتا ہوں گُلی!" — میں نے اُسے پیار سے کہا — "میں جانتا ہوں تم کسے چاہتی ہو۔ چوہدری نے اُس کا اس گاؤں میں آنا بند کر دیا تھا۔ اب نہ ڈرو۔ اب تم آزاد ہو۔ میں خود تمہاری شادی اُس آدمی کے ساتھ کراؤں گا۔"

"اللہ آپ کا بھلا کرے" — اُس نے کہا — "آپ نمبردار سے کہہ دیں۔ وہ یہ کام کرا دے گا۔"

وہ خوش ہو گئی جس سے میرا کام آسان ہو گیا۔ اُس نے بلا جھجک تسلیم کر لیا کہ مقتول نے اُسے لڑکپن میں ہی داشتہ بنا لیا تھا اور وہ اُس کے ساتھ اتنے زیادہ پیار اور اتنی زیادہ شفقت سے پیش آتا تھا کہ وہ بےچاری اپنے ماں باپ کو بھول گئی۔ وہ مقتول کا احسان چکانے کے لئے اُس کی داشتہ بنی رہی۔ اُس نے میرے ساتھ خاصی لمبی بات کی تھی۔ ہر لفظ سنانے کی ضرورت نہیں۔ اُس کی یہ بات بتانی ضروری ہے جو اُس نے کہی تھی کہ وہ اپنی ساری جوانی چوہدری کے ساتھ نہیں گزارنا چاہتی تھی۔ اُسے احساس تھا کہ اُس کی شادی ہونی چاہیئے۔ اُسے چوہدری کے ساتھ محبت تو نہیں تھی۔

اُسے یہ مزارعہ مل گیا۔ میں تفتیش وغیرہ سے متعلقہ افراد کے نام ویسے بھی بدل کر لکھا کرتا ہوں لیکن مزارعہ کا نام میری ڈائری میں محفوظ نہیں نہ یاد رہا ہے۔ میں اُسے روشن کہوں گا۔ ان لوگوں کے نام ایسے ہی تھے۔ روشن گُلی کو کہاں، کیسے اور کب ملا، ذرا طویل رُوداد ہے۔ یہ گُلی نے مجھے

سنائی تھی۔ میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ روشن کی دلیری اور بےخوفی نے مجھے حیران کر دیا۔ یہ تو سُنا چکا ہوں کہ گُلی روشن سے ملتی رہی۔ روشن گُلی کے گاؤں میں کبھی کبھی آیا کرتا تھا۔ ایک روز پکڑا گیا اور مقتول نے دونوں کو مارا پیٹا۔ گُلی نے مجھے بتایا کہ روشن کبھی کبھی رات کو آیا کرتا اور مقتول کی حویلی کے ایک کمرے میں گُلی سے ملا کرتا تھا۔

یہ حویلی کا وہ حصہ تھا جس میں مویشی رہتے تھے اور ایک کمرہ گُلی کا تھا۔ دونوں حصوں کے درمیان دروازہ تھا۔ روشن اپنے گاؤں سے اِس گاؤں میں شام کے بعد آتا۔ اُس کے رشتہ داروں کا ایک بچہ گُلی کو اطلاع دے جاتا اور گُلی دوسری طرف کا دروازہ کھُلا رکھتی۔ چند قدم کے فاصلے پر مقتول اپنی نئی بیوی کے ساتھ مگن ہوتا۔

"اُس کے پاس کلہاڑی، چاقو یا کوئی ہتھیار ضرور ہوتا ہوگا" — میں نے کچھ سوچ کر کہا — "خالی ہاتھ تو نہیں آتا ہوگا۔"

"کبھی کلہاڑی لاتا تھا" — گُلی نے کہا — "اور کبھی اُس کے پاس برچھی ہوتی تھی۔"

برچھی کا نام سُن کر میں چونکا۔

"برچھی تو بڑی لمبی ہوتی ہے" — میں نے کہا — "برچھی کو کیسے سنبھالتا ہوگا۔"

"نہیں" — گُلی نے کہا — "یہ نیزہ بازی والی برچھی نہیں اُسے تو نیزہ کہتے ہیں۔ روشن کی برچھی اُس کے قد جتنی ہے۔"

میں نے اپنا شک رفع کرنے کے لئے اُس سے پوچھا کہ مقتول کی پرانی بیوی کا مقتول کے ساتھ رویہ کیسا تھا۔

"بہت اچھا" — گُلی نے جواب دیا — "چوہدرانی چوہدری کو اتنا چاہتی تھی کہ اُس نے چوہدری کی خوشی کی خاطر دوسری بیوی لانے پر ذرا سی بھی ناراضگی نہ دکھائی۔ چوہدرانی چوہدری کو شریف آدمی سمجھتی تھی۔ وہ مجھ پر بھی شک نہیں کرتی تھی۔"

"تم روشن کے ساتھ چلی کیوں نہ گئیں؟" ــــ میں نے پوچھا۔

"پانچ چھ دنوں بعد میں نے اُس کے ساتھ یہاں سے بھاگ جانا تھا" ــ اُس نے جواب دیا ــــ "اب چلی جاؤں گی اور ہماری شادی ہو جائے گی"۔

"کیا تم نے روشن کو بتایا نہیں کہ چوہدری نے تمہیں بے نکاحی بیوی بنایا ہُوا ہے؟" ــــ میں نے پوچھا۔

"بتا دیا تھا" ــ اُس نے جواب دیا ــــ "روشن کو چوہدری پر اس کا بہت غصہ تھا۔ کہتا تھا کہ یہ چوہدری غریبوں اور یتیموں کی عزتوں کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ مجھے اللہ اور قرآن کی قسم ہے کہ روشن نے میرے ساتھ چوہدری والا تعلق نہیں رکھا تھا۔ کہتا ہے کہ ہم بہت جلد میاں بیوی بننے والے ہیں"۔

میں نے گلی کو اُٹھا دیا اور روشن کے رشتہ داروں میں سے ایک آدمی کو بلایا جو کبھی کا باہر آیا بیٹھا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ روشن کیسا آدمی ہے۔ اُس نے بتایا کہ وہ کسی سے ڈرنے والا آدمی نہیں۔ یہ تو میں اسی سے اندازہ کر چکا تھا کہ وہ مقتول کے گھر آ کر اُس کی نوکرانی بلکہ داشتہ سے مِل جاتا تھا۔

"وہ اپنے چوہدری کا خاص آدمی ہے" ــ اِس آدمی نے کہا ــــ "کوئی اُس کے آگے سَر نہیں اُٹھاتا۔ چار سال سے کچھ زیادہ عرصہ گزرا اس کے چوہدری کا ایک دشمن قتل ہو گیا تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ قاتل روشن ہے۔ روشن گرفتار بھی ہُوا تھا لیکن پولیس نے اُسے چھوڑ دیا تھا۔ تھانے میں اس کی اتنی پٹائی ہوتی تھی کہ وہاں سے آیا تو کتنے ہی دن چارپائی پر پڑا رہا تھا لیکن اقبالی نہیں ہُوا تھا"۔

"سُنا ہے اپنے قد جتنی لمبی برچھی ہاتھ میں رکھتا ہے" ــ میں نے کہا۔

"کبھی کلہاڑی اور کبھی برچھی" ــــ اُس کے رشتہ دار نے جواب دیا۔

مختصر یہ کہ اس آدمی سے مجھے ایسے اشارے ملے جن سے میں نے تفتیش کا رُخ پھیر دیا۔ یہ شخص روشن قتل کرنے کی صلاحیت اور ہمت رکھتا

تھا۔ وہ جس گاؤں کا رہنے والا تھا وہ گاؤں دوسرے تھانے کے تحت آتا تھا۔ میں روشن کو تھانے طلب کر سکتا تھا لیکن اُس کی برچھی دیکھنی ضروری تھی۔ یہاں چھاپے کی ضرورت تھی۔ میں اُسی وقت اُس گاؤں کو روانہ ہو گیا۔

میری بہن کو ہاتھ نہ لگانا

میں وہاں شام کے بعد رات کے اندھیرے میں پہنچا۔ پہلے میں علاقہ تھانیدار کے گھر گیا۔ وہ پٹھانکوٹ کے قریب کا رہنے والا مسلمان تھا۔ اُس کو واردات اور اُس وقت تک کی تفتیش سنائی۔ کھانا اُسی کے گھر کھایا۔ اُس نے اپنا ایک ہیڈ کانسٹیبل میرے ساتھ کر دیا۔ میرے پاس دو ٹارچیں تھیں۔ تھانیدار نے اپنے ہیڈ کانسٹیبل کو بھی ایک ٹارچ دے دی۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل اور تین کانسٹیبل پہلے ہی میرے ساتھ تھے۔

میں اس پارٹی کو ساتھ لے کر روشن کے گاؤں گیا۔ نمبردار کو جگایا گیا۔ میرے کہنے پر وہ دو لالٹینیں لے آیا۔ اُس کی رہنمائی میں روشن کے گھر گئے۔ یہ کچا مکان تھا۔ دروازے پر دستک دی۔ دروازہ ایک بوڑھے آدمی نے کھولا۔ نمبردار نے بتایا کہ یہ روشن کا باپ ہے۔ باپ نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ روشن اندر سویا ہُوا ہے۔ ہم سب اندر چلے گئے۔

روشن جاگ کر صحن میں آ گیا۔ تین بڑی ٹارچوں اور دو لالٹینوں کی روشنی کافی تھی۔ میں نے خانہ تلاشی شروع کی۔ دو ہی کمرے تھے۔ ایک کمرے سے ایک لاٹھی ملی جس کی لمبائی پانچ فٹ سے کچھ زیادہ تھی۔ یہ روشن کی چارپائی کے نیچے پڑی ہوئی تھی۔ ایک سرے سے یہ ٹوٹی ہوئی تھی۔ موقعۂ واردات سے ملنے والی برچھی کی اَنی میرے پاس تھی۔ اس میں لکڑی تھی جو تین چار انچ باہر سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ میں نے اس ٹکڑے کو برآمد ہونے والی لاٹھی کے ٹوٹے ہوئے سرے کے ساتھ جوڑا تو اس پر فٹ آ گیا۔ برچھی مکمل ہو گئی۔ میں نے ٹارچ کی روشنی قریب کر کے

دیکھی۔ جہاں سے یہ ٹوٹی تھی وہاں ہلکے سرخ نشان تھے۔ لکڑی مٹیالے رنگ کی تھی۔

"روشن!" — میں نے اُسے کہا — "کلہاڑی خود میرے حوالے کر دو۔"

"کونسی کلہاڑی؟" — اُس نے پوچھا۔

میں نے اُس کے پیٹ پر بڑی زور سے گھونسہ مارا۔ وہ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر آگے کو دوہرا ہو گیا۔ میں نے اُس کے پہلو میں گھونسہ مارا۔ وہ دیوار کے ساتھ جا لگا اور گر پڑا۔ میں نے گردن پر پاؤں رکھ کر اپنے جسم کا وزن ڈالا اور کہا کہ کلہاڑی میرے حوالے کر دو اور بتاؤ تمہارے ساتھ کون کون تھا۔

اُس کے گھر میں اُس کا باپ، ماں، ایک بہن اور ایک چھوٹا بھائی تھا۔ بہن کو میں نے دیکھ لیا۔ اُس کی عمر پندرہ سولہ سال تھی۔

"اِس کی بہن کو تھانے لے چلو" — میں نے کہا — "لے چلو باہر اس کی بہن کو" — میں نے اُس کی گردن سے پاؤں اُٹھا لیا۔

"میری بہن کو ہاتھ نہ لگانا" — روشن نے کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا — "بولو کیا چاہتے ہو!"

"تمہارا اقبالی بیان!" — مَیں نے کہا — "وہ کلہاڑی جس سے تم نے چوہدری شاہباز کو قتل کیا ہے اور تمہارے ساتھ جو کوئی تھا، وہ بھی بتا دو۔"

"غریب آدمی پر ظلم نہ کرو تھانیدار صاحب!" — اُس نے کہا۔

اب میں نے اُس کے چہرے کی وہ طرف دیکھی جو پہلے میرے سامنے نہیں آئی تھی۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا۔ جبڑے پر ٹھوڑی سے کان کے اُوپر والے حصے تک نیلے سرخ رنگ کی موٹی لکیر تھی جیسے بید یا کسی بھی لکڑی کی چھڑی کی ضرب سے پڑ جاتی ہے۔ فوراً مجھے مقتول کے ہنٹر کا خیال آیا۔ میں نے اُس کا کُرتہ اُتروا دیا۔ ایسی ہی

ایک لکیر اُس کے بائیں پہلو پر تھی جو پیٹھ تک گئی ہوئی تھی۔

"یہ ضربیں کیسے آئی ہیں؟" — میں نے پوچھا — "کس نے تمہیں مارا ہے؟ .... یہ سوچ کر جواب دینا کہ جس کا بھی نام لو گے اُس سے میں پوچھوں گا .... اور یہ بھی سوچ لو کہ تمہارے گھر تک میں ویسے ہی نہیں پہنچ گیا۔ پکی شہادت لے کر آیا ہوں۔"

وہ چُپ چاپ میرا مُنہ دیکھتا رہا۔ یہ ضربیں مقتول کے ہنٹر کی تھیں۔ مَیں نے پھر اُسے دھمکیاں دیں جو اُس کی بہن سے تعلق رکھتی تھیں۔ آخر اُس نے مجھے الگ ہو کر بات کرنے کا اشارہ کیا۔ میں اُسے صحن میں لے گیا۔ اُس نے اقبالِ جرم پر آمادگی ظاہر کر دی اور اس کے عوض کچھ رعایت مانگی۔ میں نے حسبِ معمول اُسے وعدہ معاف گواہ بنانے کا وعدہ کیا۔

اُس نے اپنے ایک ساتھی کی نشاندہی کر دی۔ میں نے اُس کے گھر جا چھاپہ مارا اور کلہاڑی برآمد کی۔ وہ بھی مزارعہ تھا۔ نمبردار نے بتایا کہ یہ بھی چوہدری کا خاص آدمی ہے۔

میں نے قتل کے دونوں آلے برآمد کرنے کی تحریری کارروائی کی اور دونوں ملزموں کو اُس علاقے کے تھانے میں لے گیا۔ رات جاگ کر دونوں کے الگ الگ بیان لئے۔ صبح تک میرے پاس دو اقبالی بیان تھے۔ ملزموں کو میں اپنے تھانے میں لے گیا۔

روشن نے قتل کی وجہ وہی بتائی جو مَیں اُوپر بیان کر چکا ہوں۔ اُس نے چوہدری شاہباز کو قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مقتول کی زندگی کے دن پورے ہو چکے تھے۔ وہ روشن کے گاؤں اپنے دوستوں سے ملنے چلا گیا۔ روشن نے شام کو اُسے اپنے گاؤں میں دیکھا اور معلوم کر لیا کہ مقتول کب واپس جائے گا۔ روشن نے اپنے ایک دوست کو ساتھ لیا۔ اُس کے پاس برچھی تھی اور اُس کا دوست کلہاڑی لے کر آیا۔ دونوں کسی اور طرف چلے گئے تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔ چکر کاٹ کر وہ گھات لگا کر بیٹھ گئے۔

چوہدری کا راستہ وہی تھا۔ وہ نشیب میں سے گزرا اور دونوں ملزم گھات سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ روشن نے اُسے برچھی ماری۔ مقتول نے ہنٹر گھما گھما کر مارے۔ ایک ضرب روشن کے مُنہ پر اور دوسری پہلو پر لگی لیکن مقتول ایک برچھی اور ایک کلہاڑی کا مقابلہ نہ کر سکا۔

روشن نے بتایا کہ مقتول اپنی گھوڑی کو اِدھر اُدھر کر رہا تھا۔ روشن کی برچھی کا ایک وار خالی گیا۔ روشن برچھی کو سنبھال نہ سکا۔ ایک طرف سے برچھی اُس کے ہاتھ میں تھی اور انی والا سرا زمین پر چلا گیا۔ گھوڑی کا پاؤں برچھی کی انی پر پڑ گیا۔ روشن نے برچھی کھینچنے کی کوشش کی۔ اس طرح برچھی انی کے قریب سے ٹوٹ گئی۔ روشن اپنا کام کر چکا تھا۔ موقعۂ واردات سے بھاگ نکلنے کی جلدی میں روشن کو خیال نہ آیا کہ وہ انی اُٹھا کر اپنے ساتھ لے جائے۔

دونوں کو عمر قید دی گئی جو اپیل میں بھی برقرار رہی۔

اُن دنوں مقدموں کی سماعت تیز ہُوا کرتی تھی۔ قتل کے مقدموں میں لمبی تاریخیں تو ملتی ہی نہیں تھیں۔ چوہدری شاہباز کے قتل کے مقدمے میں پورے چھ مہینے نہیں لگے تھے۔ ہائی کورٹ نے اپیل کا فیصلہ بھی ایک یا ڈیڑھ مہینے میں سُنا دیا تھا۔ اپیل کے فیصلے کے کچھ دن پہلے یا کچھ دن بعد مقتول چوہدری شاہباز کی دوسری بیوی نسیم کا بچّہ پیدا ہُوا۔ یہ لڑکا تھا۔

مجھے ان لوگوں کے ساتھ اب کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ میری دلچسپی صرف اس کیس کے ساتھ تھی۔ کیس کامیابی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ کسی تھانیدار کے تیار کئے ہوئے مقدمے میں ملزموں کو سزا ہو جاتے تو وہ تھانیدار بہت خوش ہوتا ہے۔ ایسی ہی خوشی مجھے حاصل ہو چکی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ جب سیشن کورٹ نے ملزموں کو سزا سنائی اور میں واپس اپنے تھانے میں پہنچا تھا تو میرا سارا عملہ بہت خوش تھا۔ فوجی بارکوں میں فوجی اور تھانوں میں پولیس کا عملہ جو باتیں کرتے ہیں وہ بہت ہی دلچسپ اور مسالے دار ہوتی ہیں لیکن انہیں سپردِ قلم نہیں کیا جا سکتا۔ میرے عملے میں سے جنہوں

نے مقتول کی نئی بیوی نسیم کو دیکھا تھا وہ اُس کے حُسن اور اُس کی جوانی کی باتیں کر کر کے دل خوش کر رہے تھے۔ انہی میں سے ایک کانسٹیبل نے بتایا تھا کہ نسیم کا بیٹا ہُوا ہے۔

میں نے جب سُنا تھا کہ نسیم نے بیٹے کو جنم دیا ہے تو میرے مُنہ سے بے اختیار یہ الفاظ نکلے تھے — "لو، جائیداد کا وارث پیدا ہو گیا ہے۔ اب کوئی اور ڈرامہ آیا کہ آیا" — دیہاتی علاقوں میں رہنے والے اور انہیں جاننے والے جانتے ہیں کہ دیہات کے لوگ اپنی زمین کے ایک ایک اِنچ کی خاطر اپنی جان تک قربان کر دیتے یا ایک دوسرے کی جانیں لے لیتے ہیں۔ سگے بھائی جائیداد کی جائز تقسیم پر بھی لڑتے اور مقدمے بازی میں اُلجھ یا لڑ جھگڑ کر ساری عمر کے لئے ایک دوسرے کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ کسی کا جائز حصّہ اور حق دینے سے بچنے کے لئے بڑے بڑے چکر چلاتے ہیں۔ نسیم تو سال سوا سال مقتول کی بیوی رہی تھی۔ اُس کے بچے کو مقتول کی پہلی بیوی جس نے مقتول کے ساتھ عمر گزاری تھی جائیداد کا اتنا بڑا حصّہ دینے پر آمادہ نہیں ہو سکتی تھی۔ مقتول کا بھائی بھی تھا۔ مَیں اُس کے خیالات اور اُس کی نیّت سے بھی آگاہ تھا۔

مجھے نئے ڈرامے کا انتظار زیادہ دن نہ کرنا پڑا۔ میں تھانے میں باہر کے دو آدمیوں کے ساتھ انہی کے کیس کے متعلق باتیں کر رہا تھا۔ عصر کا وقت تھا۔ ایک معزز دیہاتی اپنے گاؤں کے نمبردار کے ساتھ آیا۔ اُس کے ساتھ ایک نوجوان بھی تھا۔ مَیں نے اِس معزز آدمی کو فوراً پہچان لیا۔ وہ مقتول چوہدری شاہباز کی نوجوان اور نئی بیوی، بلکہ نئی بیوہ، کا باپ تھا۔ اُس کا چہرہ دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ اچھی خاصی واردات ہو گئی ہے۔

"آؤ ماسٹر صاحب!" — مَیں نے نسیم کے باپ سے کہا۔ گاؤں میں اُسے ماسٹر صاحب کہتے تھے۔ شاید اس لئے کہ وہ پڑھا لکھا آدمی تھا۔ اسے بیٹھنے کو کہا اور پوچھا — "کیسے آنا ہُوا؟ خیریت تو ہے؟"

اُس کے آنسو نکل آئے۔

"خیریت کہاں ملک صاحب!" — نمبردار نے کہا — "آج ان کا دوہتا لاپتہ ہوگیا ہے۔"

"کون؟" — میں نے حیران ہو کر پوچھا — "ان کی بیٹی نسیم کا نومولود بچہ؟ .... وہ تو بے چارہ یتیم پیدا ہوا ہے۔"

"جی ملک صاحب!" — نسیم کے باپ نے کہا — "آج اس کی عمر اکیس دن ہوئی ہے۔ میری بیٹی کی زچگی کا عرصہ ابھی آدھا ختم ہوا ہے۔"

میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ گاؤں میں صبح ایک آدمی مر گیا ہے۔ نسیم کا باپ اس کے گھر گیا ہوا تھا۔ نسیم کی ماں بھی وہیں گئی ہوئی تھی۔ نسیم کے دونوں بھائی گھر نہیں تھے۔ نسیم گھر میں اکیلی تھی۔ خاوند کے قتل کے تین ماہ بعد وہ اپنے ماں باپ کے گھر آگئی تھی۔ اس کی زچگی کا اکیسواں دن تھا۔ وہ تندرست تو ہوگئی تھی لیکن چالیس دن پورے کر کے ہی باہر نکل سکتی تھی۔

گاؤں کی دائی ایک دو بار روزانہ نسیم کی دیکھ بھال کے لئے اس کے گھر جایا کرتی تھی۔ اس کا پیٹ ملتی اور جسم کو دباتی تھی۔ اس روز بھی دائی آئی۔ موسم سرما تھا۔ سردی بہت تھی۔ نسیم نے بچے کو جس کی عمر اس روز اکیس دن ہوتی تھی، دودھ پلا کر دھوپ میں سلا دیا تھا۔ چارپائی صحن میں تھی۔ نسیم ابھی بچے کے پاس ہی بیٹھی ہوئی تھی کہ دائی آگئی۔ اس نے نسیم سے کہا کہ اندر چلو، پیٹ مل دوں اور سر کی بھی مالش کر دوں۔

نسیم کمرے میں جا کر پلنگ پر لیٹ گئی اور دائی نے اس کا پیٹ ملنا شروع کر دیا۔ اتنے میں باہر والے دروازے پر دستک ہوئی۔ گھر میں اور کوئی تو نہ تھا، دائی باہر گئی اور دو منٹ بعد واپس آگئی۔

"کون ہے؟" — نسیم نے پوچھا۔

"ایک آدمی تمہارے اباجی کی پوچھ رہا تھا" — دائی نے جواب دیا — "میں نے اسے بتایا ہے کہ وہ ماتم والے گھر گئے ہوتے ہیں۔"

"گاؤں کا کوئی آدمی تھا؟" — نسیم نے پوچھا۔

"شاید گاؤں کا ہی تھا" — دائی نے کہا — "کسی اور گاؤں کا مہمان ہوتا تو میں اسے جانے نہ دیتی۔ میں نے پہچانا نہیں۔ اس نے کھیس اس طرح لے رکھا تھا کہ منہ اور ناک پر کھیس تھا۔ خود ہی کہنے لگا کہ وہیں جا کر ماسٹر صاحب سے مل لوں گا۔"

نسیم کے باپ نے مجھے بتایا کہ نسیم کمرے میں لیٹی ہوئی تھی۔ بچہ باہر صحن میں دھوپ میں سویا ہوا تھا۔ دائی نے نسیم کا پیٹ ملنا شروع کر دیا۔ پھر اس کے سر کی مالش کی پھر دونوں باہر آئیں تو دیکھا کہ بچہ غائب ہے۔ بچہ ابھی اکیس دنوں کا ہی تھا۔ دائی نے گھبرا کر کہا کہ بچے کو باہر سے کوئی کتا ہی اٹھا کر نہ لے گیا ہو۔ دونوں باہر کو دوڑیں۔ گلی میں لوگ آ جا رہے تھے۔ رات تو نہیں تھی، دن کے ساڑھے دس یا گیارہ کا وقت تھا۔

دائی اور نسیم نے شور مچایا۔ نسیم ماں تھی۔ اس کی تو چیخیں نکل رہی تھیں گاؤں کے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ نسیم کا باپ آگیا، ماں بھی اور بھائی بھی آ گئے۔ اگر یہ لوگ کسی کو گھوڑے پر یا سائیکل پر تھانے کو دوڑا دیتے تو میں فوراً گاؤں سے نکلنے والے راستوں پر کانسٹیبلوں کو دوڑا دیتا۔ تھانہ جس گاؤں میں تھا وہاں سے گھوڑے بھی مل سکتے تھے اور سائیکلیں بھی۔ میں بچے والے گاؤں کے ہر اس گھر کی تلاشی لیتا جس پر ذرا سا بھی شبہ ہوتا، مگر ان احمقوں نے گاؤں میں اور گاؤں کے اردگرد اپنے طور پر تلاش شروع کر دی اور تھانے میں عصر کے وقت آئے۔ میرے اندازے کے مطابق انہوں نے پانچ ساڑھے پانچ گھنٹے ضائع کر دیے۔ ان کے گاؤں سے تھانہ صرف ایک میل کے فاصلے پر تھا۔

بیٹی کی شادی کر دو ورنہ ....

میرے ذہن میں جو شبہے آتے ان میں سب سے پہلا نام چوہدری سکندر کا تھا۔ یہ شخص مقتول شاہباز کا چھوٹا بھائی تھا۔ آپ اس کا وہ بیان

ایک بار پھر پڑھیں جو اُس نے اپنے بھائی کے قتل کی تفتیش میں مجھے دیا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ تمہارے بھائی نے جائیداد کا وارث پیدا کرنے کے لئے ایک جوان لڑکی کے ساتھ شادی کی تھی۔ خود قتل ہو گیا ہے۔ اب جائیداد کا وارث کیسے پیدا ہوگا؟ سکندر نے جواب دیا تھا کہ نسیم تین ماہ سے امید سے ہے۔ اگر اس کا لڑکا پیدا ہوا تو وہ یعنی سکندر نسیم کے ساتھ شادی کرے گا اور اپنے بھائی کی ساری جائیداد اس کے بچے کے نام رجسٹری کرا دے گا۔ اس شخص پر میرا شبہ یہ تھا کہ اس نے نسیم سے کہا ہوگا کہ وہ اس کے ساتھ شادی کرے اور نسیم نے انکار کر دیا ہوگا۔ سکندر نے جائیداد کے وارث کو غائب کرنا ضروری سمجھا ہوگا۔ یہ یاد رکھیں کہ سکندر شادی شدہ تھا اور اُس کے بچے بھی تھے۔

مشتبہوں کی فہرست میں دوسرا نام مقتول شاہباز کی پہلی بیوی کا آتا تھا۔ وہ باہر سے آئی ہوئی لڑکی کے بچے کو جائیداد کا وارث کیوں بننے دیتی؟ اس پہلی بیوی کے ساتھ اُس کے بھائیوں کے نام بھی آتے تھے۔ ان کی مدد کے بغیر یہ عورت بچہ غائب نہیں کرا سکتی تھی۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ ان سب نے مل کر یہ واردات کی ہے۔ واردات کا باعث بالکل صاف تھا۔ یہ لوگ چوہدری شاہباز کی جائیداد میں سے نسیم کے بچے کو کچھ نہیں دینا چاہتے تھے۔

میں پولیس آفیسر تھا۔ عام سی قسم کا شہری نہیں تھا کہ مجھے کچھ پتہ نہ ہوتا۔ میں جرم و سزا کی دنیا کا آدمی تھا۔ تھانوں اور کچہریوں میں ایسے بے شمار کیس دیکھے تھے۔ معصوم بچوں کو جائیداد کی خاطر اغوا اور قتل ہوتے دیکھا تھا۔ اب ایسا ایک اور کیس آ گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ ان مشتبہوں کے خلاف کچھ شہادت لے لوں۔ نسیم کا باپ ابھی میرے سامنے بیٹھا تھا۔ میں بتا چکا ہوں کہ گاؤں میں لوگ اُسے ماسٹر صاحب کہتے تھے لیکن میرے دل میں اس شخص کی ذرا سی بھی عزت نہیں تھی اس لئے میں اُسے صاحب نہیں کہتا تھا۔ اُس نے اپنی نوجوان بیٹی کو روپے

پیسے کے لالچ میں اپنی عمر کے آدمی کے ساتھ بیاہ دیا تھا اور اب اُس کی بیٹی کو جو صدمہ پہنچا تھا وہ ناقابلِ برداشت تھا۔

"تمہیں کسی پر شک ہے ماسٹر؟" — میں نے نسیم کے باپ سے پوچھا۔

"ہاں صاحب!" — اُس نے جواب دیا — "شک چوہدری شاہباز کے بھائی چوہدری سکندر اور بڑی چوہدرانی اور چوہدرانی کے دونوں بھائیوں پر ہے۔"

"کیوں؟" — میں نے پوچھا — "کوئی ایسی وجہ بیان کرو جو تفتیش میں میری مدد کر سکے۔"

"صاحب! وجہ تو شاید آپ کو بھی معلوم ہوگی" — اُس نے کہا — "یہ بچہ چوہدری شاہباز کی جائیداد کا وارث ہے۔"

"یہ تو میں جانتا ہوں" — میں نے اُسے ٹوکتے ہوئے کہا — "تم یہ بتاؤ کہ ان لوگوں کے ساتھ جائیداد کے متعلق ابھی کوئی بات تو نہیں ہوئی؟"

"میں جناب کو یہی بتانے لگا تھا" — اُس نے کہا — "دو اڑھائی ہفتے گزرے چوہدری سکندر نے کہا تھا کہ ماسٹر صاحب اپنی بیٹی کی کہیں شادی کر دو۔ میری بیٹی کا بچہ پیدا ہو چکا تھا اور سکندر مجھے مبارک دینے آیا تھا۔ میں نے اُس کی خاطر تواضع کی۔ وہ جانے کے لئے اُٹھا اور مجھے باہر لے گیا۔ باہر اُس نے مجھے یہ بات کہی تھی۔ میں نے اُسے گول مول سا جواب دیا۔ اُس نے مجھے گھورا اور کہنے لگا — 'ماسٹر صاحب، میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں کہہ رہا ہوں کہ میرے بھائی کی جائیداد میں سے حصے کی امید نہ رکھنا۔ یہ نہ کہنا کہ چوہدری شاہباز کی جائیداد کا وارث پیدا ہو گیا ہے' ....

"میں نے اُسے کہا کہ میں بچے کا حصہ تو نہیں چھوڑوں گا۔ نہیں دو گے تو عدالت میں جاؤں گا۔ اُس نے کہا — 'سوچ سمجھ کر ماسٹر صاحب! آپ

میرا مقابلہ نہیں کر سکو گے‘ — میں نے کہا — ’تم نے اچھا کیا ہے چوہدری سکندر، مجھے اپنی نیت پہلے ہی بتا دی ہے۔ تم بھی سوچ سمجھ لو چوہدری! انگریز کے قانون کو تم جیسے اَن پڑھ موڑ توڑ نہیں سکتے‘ — اُس نے عجیب طرح ہنس کر کہا — ’دیکھ لینا انگریز کا قانون کس طرح ٹوٹتا ہے‘ — یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔“

”سکندر نے ایسی بات کہی تھی کہ وہ بچے کو غائب کر دے گا؟“ — میں نے پوچھا۔

”یہ الفاظ تو نہیں کہے تھے“ — نسیم کے باپ نے جواب دیا — ”اُس نے دھمکیاں کچھ ایسی ہی دی تھیں۔ دو تین روز بعد چوہدری شاہباز کی بیوی کا بھائی حنیف مجھے ملا اور کہنے لگا — ’ماسٹر صاحب! آپ کو چوہدری سکندر نے کچھ کہا تھا‘ — میں نے کہا کہ مجھے یاد ہے اُس نے کیا کہا تھا۔ حنیف نے پوچھا کہ مَیں نے اس پر غور کیا ہے یا نہیں۔ مَیں نے کہا — ’چوہدریو! ہوش میں آؤ۔ اپنے آپ کو بادشاہ سمجھنا چھوڑ دو۔ میں نے سکندر سے کہہ دیا تھا کہ میں بچے کا حصہ نہیں چھوڑوں گا‘ — حنیف نے کہا — ’پچھتاؤ گے ماسٹر جی‘! — میرا جواب سُنے بغیر وہ چلا گیا....

”پھر حنیف کا دوسرا بھائی ملا۔ اُس نے کہا — ’سُنا ہے ماسٹر صاحب! آپ قانونی چارہ جوئی کی دھمکیاں دے رہے ہیں‘! — میں نے کہا — ’دھمکی کیسی! کیا میری بیٹی چوہدری شاہباز کی بیوی نہیں تھی؟ کیا اُس کا بچہ چوہدری شاہباز کا بیٹا نہیں؟‘ — اُس نے کہا — ’بیٹی اور اُس کے بیٹے کی خیر مانگو‘ — تین چار دنوں بعد سکندر نے مجھے راستے میں روک کر کہا — ’ماسٹر صاحب! عدالت میں جاؤ گے یا میری بات مانو گے؟.... گاؤں میں رہنا ہے تو میری بات مان لو۔ بیٹی کی شادی کر دو ورنہ وہ بھی روئے گی اور آپ بھی .... میں آپ کو تھوڑی سی رعایت دیتا ہوں۔ چوہدری شاہباز کی زمین کا کچھ حصہ بچے کو دے دوں گا۔ پورے حصے کی اُمید نہ رکھنا‘...

”میں نے اُسے کہا — ’چوہدری شاہباز کی جائیداد کے متولی

اور مختار تم کیوں بنے پھرتے ہو چوہدری سکندر؟ اُس کے بیٹے کی وراثت پر تم تو قبضہ نہیں کر سکتے‘ — اُس نے مجھے طعنے دینے شروع کر دیے۔ اُس نے کہا — ’تم نے چوہدری شاہباز کی زندگی میں اُسے بہت لُوٹا تھا پھر اپنی بیٹی کی نقد قیمت وصول کی تھی۔ اب تمہیں کچھ نہیں مل سکتا۔ اونچی بات کرو گے تو مُنہ کی کھاؤ گے‘ — میں نے پوچھا کہ تم کیا کرو گے؟ — اُس نے جواب دیا — ’تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں کیا کروں گا۔ تیار رہنا‘ — اس طرح یہ لوگ مجھے دھمکیاں دیتے رہے۔“

اُس نے ان کی کچھ اور دھمکیاں سنائیں اور یہ بھی بتایا کہ وہ بچے کا حصہ نہیں چھوڑے گا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ بڑی چوہدرانی کا رویہ کیا ہے۔

”وہ تو عورتوں کے ذریعے ہم تک پیغام پہنچاتی رہتی ہے“ — اُس نے بتایا — ”کہتی ہے کہ بچے کو تھوڑا سا حصہ دے دیں گے۔ اگر ماسٹر نے گڑبڑ کی تو پچھتائے گا۔“

مجھے رحم اس اکیس دنوں کے معصوم بچے اور اس کی ماں پر آرہا تھا ظلم تو ان پر ہُوا تھا۔ اصل مجرم نسیم کا باپ تھا لیکن قانون کچھ اور کہتا تھا۔

بچہ دے دو شادی کر لُوں گی

مقتول چوہدری شاہباز کے خاندان کے افراد سے مجھے ایسی ہی باتوں کی توقع تھی۔ بچہ انہوں نے ہی غائب کیا تھا۔ میرے سامنے دو مسئلے تھے۔ ایک یہ کہ ان لوگوں کو اقبالی کروانا اور دوسرا یہ معلوم کرنا کہ انہوں نے بچے کو اٹھایا کیسے اور کس سے اُٹھوایا۔ انہوں نے واردات کے لیے دن اور وقت اچھا دیکھا تھا۔ گاؤں میں ماتم تھا اور نسیم کے ماں باپ ماتم والے گھر چلے گئے تھے۔

ایک سوال یہ بھی تھا — کیا دائی کا بھی اس میں ہاتھ تھا؟

نمبردار بھی نسیم کے باپ کے ساتھ تھانے آیا تھا۔ اُس سے بہت کچھ پوچھنا تھا لیکن میں اُٹھ کھڑا ہُوا۔ مجھے گاؤں جلدی پہنچنا چاہیے تھا۔ میری کوشش یہ تھی کہ بہت تیزی سے ملزموں تک پہنچوں تاکہ بچہ قتل ہونے سے بچ جاتے مگر اس صورتِ حال نے پریشان کر دیا کہ بچے کی گمشدگی کی رپورٹ میں پہلے ہی اِن لوگوں نے پانچ گھنٹے ضائع کر دیئے تھے۔ یہ پانچ گھنٹے بہت قیمتی تھے۔ کم و بیش ڈیڑھ گھنٹہ نسیم کے باپ کا بیان لینے میں اور کاغذی کارروائی میں گزر گیا۔

میں نے دو ہیڈ کانسٹیبل اور چھ کانسٹیبل ساتھ لئے۔ ایک یکّہ منگوایا اور گاؤں کو روانہ ہو گیا۔ پگڈنڈی کچی، یکّے پر گیارہ بارہ آدمی سوار اور گھوڑا کمزور۔ یہ تو پیدل چلنے والی رفتار تھی۔ گاؤں میں داخل ہوتے تو رات کالی سیاہ ہو چکی تھی۔ فاصلہ ایک ہی میل تھا۔ میں راستے میں نمبردار سے پوچھ گچھ کرتا گیا تھا۔ میں نے ذہن میں یہ بات رکھی ہوئی تھی کہ نمبردار اسی برادری کا فرد تھا لہٰذا اس کی ہمدردیاں سکندر وغیرہ کے ساتھ تھیں۔

اُس نے پہلی بات یہ بتائی کہ مقتول کی پہلی بیوی جسے میں بڑی چوہدرانی لکھ رہا ہوں اور سکندر چوہدری شاہباز کے مربعوں پر منٹگمری (موجودہ ساہیوال) گئے ہوئے ہیں۔ وہ بچے کی گمشدگی کے دو دن پہلے گئے تھے۔ یہ سُن کر مجھے یہ خیال آیا کہ یہ دونوں بچے کی گمشدگی سے پہلے گاؤں سے نکل گئے تھے کہ ان پر شک نہ ہو۔ مجھے یہ شُبہ بھی ہُوا کہ بچہ اغوا کر کے ان تک مربعوں پر پہنچا دیا گیا ہے اور وہاں یا تو قتل کر دیا گیا ہے یا اسے نسیم کو جائیداد کے حصے سے دستبردار ہو جانے پر راضی کرنے کے لئے یرغمال کے طور پر رکھا گیا ہے۔

میں نے نمبردار کے ساتھ بہت سی باتیں کی تھیں۔ اُس نے بھی یہی کہا تھا کہ بچے کو انہی لوگوں نے اٹھوایا ہے۔ میرے خیال میں یہ واردات کچھ اس طرح کی گئی تھی کہ پہلے ایک آدمی نے نسیم کے دروازے

پر دستک دی اور اُس نے نسیم کے باپ کی پوچھی۔ وہ یہی دیکھنے آیا ہو گا کہ گھر میں کوئی ہے تو نہیں۔ دائی اُسے جواب دے کر کمرے میں نسیم کے پاس چلی گئی۔ اس آدمی نے ڈیوڑھی میں آکر اندرونی دروازے سے دیکھا کہ بچہ صحن میں اکیلا پڑا ہے اور سامنے کوئی نہیں۔ اُس نے بچے کو اٹھایا کھیس کے اندر کیا اور چلا گیا۔ اکیس دنوں کا بچہ ہوتا ہی کیا ہے۔ اسے ساہیوال کے کسی چک میں پہنچانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ کسی نوکر یا مزارعہ کی بیوی، بہن یا بیٹی کو سفر کے لئے ساتھ لے لیا گیا ہو گا۔

"تم نے ایک کام کرنا ہے چوہدری!" — میں نے نمبردار سے کہا — "اگر تمہیں معلوم ہے تو بتا دو۔ اگر نہیں تو گاؤں میں پتہ کر کے بتانا... کیا گاؤں کا کوئی مزارعہ یا کوئی کمین ذات اپنی بیوی یا گھر کی کسی اور عورت کے ساتھ آج بچے کے اغوا کے بعد گاؤں سے کہیں باہر گیا ہے؟"

"مجھے پتہ تو نہیں!" — نمبردار نے جواب دیا — "پتہ کرا لوں گا۔"

"پتہ تو مجھے چل ہی جاتے گا" — میں نے کہا — "اگر تم نے پردہ ڈالا تو اپنا حشر سوچ لینا۔"

"ملک صاحب حضور!" — اُس نے یکّے میں میرے کان میں کہا — "آپ کو تو معلوم ہے یہ لوگ میرے رشتہ دار ہیں۔ میں آپ کی جُوتیوں کا غلام ہوں۔ مخبری اور جاسوسی پوری کروں گا۔ آپ مجھ پر پردہ ڈالے رکھنا اور گواہی دینے کے لئے عدالت میں پیش نہ کرنا۔"

ایک بات بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ آج کل بچوں کے اغوا کی وارداتیں اتنی عام ہو گئی ہیں جیسے میرے وقتوں میں معمولی سی چوری چکاری کی وارداتیں بھی نہیں ہُوا کرتی تھیں۔ آج کل خرکار لڑکوں کو اغوا کرتے ہیں۔ دوسرے بھیک مانگنے والے اغوا کر کے پیسہ کماتے ہیں۔ یہ لوگ دُودھ پیتے بچوں کو اغوا کر کے ان کے بازو یا ٹانگیں توڑ کر یا ٹیڑھی کر کے انہیں بھیک مانگنے کے لئے تیار کرتے ہیں۔ اب ملک ترقی کر گیا ہے

اس لئے یہاں بھی ترقی یافتہ ملکوں والے جرائم شروع ہو گئے ہیں۔ ان میں ایک یہ ہے کہ کسی دولت مند گھر کا بچہ اغوا کر کے لاکھوں روپیہ تاوان مانگا جاتا ہے۔ میرے وقتوں میں کسی بچے کے اغوا کی واردات برسوں بعد ایک سننے میں آتی تھی۔ یہ واردات انتقامی ہوتی تھی۔

گاؤں میں پہنچتے ہی میں نے ایک کانسٹیبل کو الگ کر کے اپنے اے ایس آئی کے لئے ایک لمبا چوڑا پیغام دیا اور کانسٹیبل سے کہا کہ وہ اسی یکے سے واپس تھانے چلا جائے۔ میرے پیغام کا لبِ لباب یہ تھا کہ اے ایس آئی رات کو ہی دو کانسٹیبلوں کو ساتھ لے کر ساہیوال کے لئے روانہ ہو جائے۔ اُس نے چوہدری شاہباز کے مربعوں والے چک جانا، وہاں کے علاقہ تھانیدار کی مدد حاصل کرنی اور چوہدری شاہباز کے مزارعوں کو الگ کھڑا کر کے اُن کے گھروں کی اور اُس گھر کی بھی جس گھر میں چوہدری سکندر اور بڑی چوہدرانی ٹھہرے ہوتے تھے بڑی سختی سے تلاشی لینی تھی اور اگر بچہ برآمد نہیں ہوتا تو کھوج لگانا تھا کہ یہاں کوئی بچہ لایا گیا ہوگا۔

کانسٹیبل چلا گیا۔ میرے پاس دو ٹارچیں تھیں۔ دو تین لالٹینیں آ گئی تھیں۔ میں نے نمبردار کی رہنمائی میں بیک وقت چار گھروں پر چھاپے مروائے — چوہدری سکندر کے گھر، بڑی چوہدرانی کے دونوں بھائیوں کے گھر اور بڑی چوہدرانی کے گھر — ایسی تلاشی لی کہ نیچے کی مٹی اُوپر کر دی اور ملا کچھ بھی نہیں۔ بڑی چوہدرانی تو وہاں تھی ہی نہیں۔ گھر میں ایک نوکر سویا ہوا تھا۔ اُسے شاملِ تفتیش کر لیا۔ اس گھر کی نوکرانی گئی بڑی چوہدرانی کے ساتھ چلی گئی تھی۔

مجھے معلوم تھا کہ میرے چھاپے ناکام رہیں گے۔ سب کو معلوم تھا کہ معاملہ تھانے تک پہنچ گیا ہے۔ اگر بچہ گاؤں میں تھا بھی تو گاؤں سے نکال دیا گیا ہوگا لیکن یہ کارروائی ضروری تھی۔ میں گاؤں پر دہشت بٹھانا ضروری سمجھتا تھا۔ بڑی چوہدرانی کے دونوں بھائیوں کو میں نے شاملِ

تفتیش کر لیا۔ میں نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ ان گھروں کے نوکر اور مزارے کون کون ہیں۔ ہیڈ کانسٹیبلوں سے کہا کہ وہ ان کے گھروں کی بھی تلاشی لیں اور انہیں اپنے ساتھ پابند کر لیں۔

میں نے بڑی چوہدرانی کے دونوں بھائیوں کو الگ کر کے کہا کہ وہ بچہ واپس کر دیں تو میں اُن کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کروں گا۔ دونوں نے اس طرح بے گناہی کی قسمیں کھانی شروع کر دیں جیسے وہ زخمی ہو کر زمین پر پڑے تڑپ رہے ہوں۔ دونوں کہتے تھے کہ وہ خود بچے کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔

"ہمیں پہلے ہی معلوم تھا کہ شک ہم پر ہی ہوگا" — ان میں ایک نے کہا — "ہم تو اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ بچہ مل جائے۔"

"دونوں اکٹھے بیٹھو" — میں نے کہا — "آپس میں صلاح مشورہ کر لو۔ تمہارے انکار کو میں اتنی جلدی نہیں مانوں گا۔"

میں نسیم کے گھر چلا گیا۔ اُس کی جذباتی حالت بہت ہی بُری تھی۔ وہ ماں تھی۔ اُس کا دودھ پیتا بچہ گم ہو گیا تھا۔ اُس کے خاوند کے قتل کی تفتیش کے دوران اسے میں مل چکا تھا۔ وہ ملاقات بڑی لمبی تھی۔ مجھے وہ اپنا ہمدرد سمجھتی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اُس نے چیخ چیخ کر رونا شروع کر دیا اور میں اُسے تسلی دینے لگا کہ اُس کا بچہ مل جائے گا۔

"دُشمن وار کر گئے ہیں" — اُس نے کہا — "وہ کہتا تھا اب میرے ساتھ نکاح پڑھا لو۔ چوہدری شاہباز کی ساری جائیداد تمہارے بچے کے نام کرا دوں گا۔"

"کون ہے وہ؟"

"چوہدری سکندر" — نسیم نے جواب دیا — "وہ میرے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔ اُسے کہو میرا بچہ دے دو۔ میں اُس کے ساتھ شادی کر لوں گی۔"

ساری عمر یاد رکھے گی

اُس نے جو بیان دیا وہ دُہرانے کی ضرورت نہیں۔ اُس کے باپ کی زبانی سُنا چکا ہوں کہ بچّہ کس طرح لاپتہ ہُوا تھا۔ نسیم نے جو نئی بات بتائی وہ یہ تھی کہ سکندر نے اُسے بچّہ پیدا ہونے سے کچھ دن پہلے کہا تھا کہ میرے ساتھ شادی کر لو۔ نسیم نے اُسے جواب دیا تھا کہ مَیں پہلے بھی سوکن بن کے گئی تھی، دوسری بار سوکن نہیں بنوں گی۔ نسیم نے اسے مذاق سمجھا تھا۔ بچّہ پیدا ہُوا تو سکندر مبارک دینے گیا اور نسیم کے پاس بیٹھا رہا۔ اُسے نسیم سے یہ کہنے کا موقع مِل گیا کہ اب میرے ساتھ شادی کرو گی تو بہت فائدے میں رہو گی۔

"چوہدری سکندر!" —— نسیم نے اُسے کہا —— "مَیں تمہیں بھائی جان کہتی رہی ہوں۔ اب بھی بھائی جان ہی کہوں گی۔ شادی کا خیال دل سے نکال دو۔"

"میں نے تمہارے فائدے کی بات کی ہے" —— سکندر نے کہا —— "میں نے پہلے ہی سوچا ہُوا تھا کہ تمہیں اگر خدا نے بیٹا دیا تو میں تمہارے ساتھ شادی کر لوں گا اور بھائی کی ساری جائیداد اِس بچّے کے نام کرادوں گا۔"

"اس میں میرا نہیں تمہارا اپنا فائدہ ہے" —— نسیم نے کہا —— "تمہیں ایسی بیوی مل جائے گی جو خوبصورت اور جوان ہے اور اس کی اتنی زیادہ جائیداد بھی ہے .... نہیں بھائی سکندر! میں تمہارے ساتھ شادی نہیں کروں گی۔"

"پچھتاؤ گی نسیم!" —— سکندر نے کہا اور چلا گیا۔

نسیم نے گاؤں کی ایک عورت کا نام لے کر مجھے سنایا کہ یہ عورت تین چار بار سکندر کا پیغام لے کر آئی تھی۔ ان پیغاموں میں دھمکیاں بھی ہوتی تھیں۔ ایک دھمکی یہ کہ چوہدری شاہباز کی جائیداد میں سے ایک انچ زمین کا بھی نہیں لے سکو گی۔ دوسری دھمکی یہ کہ اس گھمنڈ میں نہ رہنا کہ تم نے

جائیداد کا وارث پیدا کیا ہے۔ ایسے کئی وارثوں کو مٹی میں ملتے دیر نہیں لگتی۔

بڑی چوہدرانی کے بھائیوں نے نسیم کو جو دھمکیاں دی تھیں وہ بھی نسیم نے سنائیں۔ مَیں نے اس عورت کو بھی بلوا لیا۔ دائی پہلے ہی وہاں موجود تھی۔ میں نے نسیم کو بھیج دیا اور نمبردار کو بلایا۔ اُس سے پوچھا کہ دائی کیسی عورت ہے۔ نمبردار نے بتایا کہ اس عورت کو بدمعاش نہیں کہا جا سکتا، چالاک اور ہوشیار کہہ سکتے ہیں۔ دائی کی عمر پینتیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اُس کا خاوند ماشکی تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ بدصورت اور بُدھو ہے۔ بڑے گھروں میں پانی ڈالنے کے علاوہ ہر قسم کی مشقت اور مزدوری کرتا تھا۔ ان کے تین یا چار بچے بھی تھے۔ دائی کی ماں بھی دائی تھی۔ ماں نے اپنی زندگی میں ہی اپنی بیٹی کو تجربہ کار دائی بنا دیا تھا۔

"کیا یہ دائی اتنی ہوشیار اور چالاک ہے کہ کسی کے بچّے کو اُٹھا کر کسی کے حوالے کر دے؟" —— میں نے نمبردار سے پوچھا۔

"انسان کی نیّت بدلنے میں کیا دیر لگتی ہے حضور!" —— نمبردار نے کہا —— "لیکن اِس عورت کے متعلق کبھی ایسی شکایت نہیں سُنی کہ کسی گھر سے اِس نے کوئی چیز چُرائی ہو۔ کسی کا بچّہ غائب کر دینا تو بہت بڑا جُرم ہے۔ میں نہیں مانوں گا کہ یہ دائی اِس واردات میں شامل ہے۔"

مَیں نسیم کے گھر کی ڈیوڑھی میں بیٹھا ہُوا تھا۔ اندر اور باہر والے دروازے بند تھے۔ سردی بہت تھی۔ انگیٹھی میں کوئلے جل رہے تھے۔ میں نے مکان دیکھ لیا تھا۔ صحن میں وہ جگہ بھی دیکھی تھی جہاں بچّہ چارپائی پر سویا ہُوا تھا۔ میں نے اُس عورت کو بلایا جو چوہدری سکندر کے پیغام نسیم کو دیا کرتی تھی۔ غریب سی کامی عورت تھی۔

"مجھ سے ڈرنا نہیں" —— میں نے اُسے کہا —— "اور جھوٹ نہ بولنا ورنہ اِن چوہدریوں کے کرتُوتوں میں تم رگڑی جاؤ گی۔"

اُس نے جھوٹ نہ بولا۔ نسیم نے سکندر کے جو پیغام مجھے بتائے

تھے وہ اس عورت نے بھی بتائے۔

"نسیم ہر پیغام کا جواب یہ دیتی تھی کہ وہ سکندر کے ساتھ شادی نہیں کرے گی" ـــ میں نے کہا ـــ "تم یہ بتاؤ کہ سکندر نسیم کا انکار سن کر کیا کہتا تھا۔"

"غصے میں آجاتا تھا" ـــ اس نے جواب دیا ـــ "دو تین گالیاں دیتا تھا پھر کہتا تھا کہ اس پر ایسا وار کروں گا کہ ساری عمر یاد رکھے گی۔"

"یہ بھی کہتا ہو گا کہ اسے قتل کر دوں گا" ـــ میں نے لقمہ دینے کے لیے کہا ـــ "اسے غائب کر دوں گا۔ اس کا بچہ گم کر دوں گا۔"

"سب کچھ کہتا تھا" ـــ اس عورت نے کہا پھر سوچ کر بولی ـــ "شاید اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اس کو یہ بچہ نظر نہیں آئے گا۔"

میں نے اس عورت سے ایک اور پہلو سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔ یہ اس شک کی بنا پر کی کہ بچہ اسی عورت سے نہ اٹھوایا گیا ہو۔ یہ عورت ذہنی لحاظ سے کھوکھلی معلوم ہوتی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں مجھے یقین ہو گیا کہ اس واردات میں اس عورت کا ہاتھ نہیں۔ اس سے مجھے یہ حاصل ہوا کہ سکندر کے دل میں نسیم کے خلاف بڑا ہی شدید عناد بھر گیا تھا۔ سکندر نے اپنا بہت بڑا فائدہ سوچا تھا۔ ایک یہ کہ ایک جوان اور خوبصورت بیوی مل جائے گی اور اس سے بڑا فائدہ یہ کہ مقتول بھائی کی جائیداد بچے کی بدولت اس کے قبضے میں آجائے گی۔ نسیم نے شادی سے انکار کر کے اسے اتنی زیادہ نعمتوں سے محروم کر دیا تھا۔ سکندر جیسے دیہاتی چوہدری کسی کا اس قسم کا "جرم" نہ اس وقت بخشا کرتے تھے نہ آج بخشتے ہیں۔

اس دوران مجھے چوہدری شاہباز کے تین جرائم پیشہ غنڈے یاد آئے ـــ بالا، شیدا اور خوشیا ـــ میں نے انہیں بلوا لیا۔ آدھی رات ہونے کو آئی تھی۔ تینوں کو جگا کر لایا گیا۔ میں نے انہیں باری باری اندر بلایا۔ ہر ایک سے جو سوال و جواب ہوئے، وہ سنانے ضروری نہیں۔

صرف یہ سنانا ضروری ہے کہ تینوں پر نیند طاری تھی اور نشے کا خمار بھی تھا۔ وہ چرس اور دیسی شراب کے نشئی تھے۔

تینوں نے کہا کہ وہ ہر برا کام کر سکتے ہیں لیکن یہ گناہ نہیں کر سکتے کہ کسی ماں کا نومولود بچہ اٹھا لیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہ خود حیران ہیں کہ یہ واردات کس نے کی ہے۔

میں نے تینوں سے پوچھا کہ پہلے وہ چوہدری شاہباز کے یار تھے اور اب چوہدری سکندر کے ساتھ ان کا یارانہ ہو گا۔ تینوں نے ایک جیسا جواب دیا۔ جواب یہ تھا کہ چوہدری شاہباز دل کا بادشاہ تھا لیکن چوہدری سکندر کہتا تھا کہ کام میرا کرو اور کھاؤ اپنے گھر سے۔ وہ کہتے تھے کہ سکندر خود غرض اور لالچی آدمی ہے۔ ہمیشہ اپنا فائدہ دیکھتا ہے۔

"کیا سکندر بچے کو غائب کرا سکتا ہے؟" ـــ میں نے تینوں سے پوچھا۔

تینوں نے کہا کہ بچہ اسی نے اٹھوایا ہو گا۔ تینوں اسی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ یہ تھانے کے باقاعدہ مخبر تو نہیں تھے لیکن تھانے والوں کو خوش کرنے کی خاطر مخبری کر لیتے تھے۔ ان کے ساتھ میری اتنی زیادہ باتیں ہوئیں کہ مجھے اس واردات میں ان کی بے گناہی پر اعتبار آ گیا۔

انہیں فارغ کر کے میں نے نمبردار کو بلا کر پوچھا کہ سکندر کے ساتھ ان تینوں کا تعلق کیسا ہے۔

"بس سلام دعا ہے" ـــ نمبردار نے جواب دیا ـــ "سکندر اپنے بڑے بھائی (مقتول) جیسا نہیں .... اب مجھ سے دوسری بات سنیں۔ آپ نے مجھے کہا تھا کہ گاؤں میں سے آج کوئی نوکر یا مزارعہ کہیں چلا گیا ہو تو آپ کو بتاؤں۔ آج شام کی گاڑی سے ان کا ایک مزارعہ اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ چوہدری شاہباز کے مربعوں پر منٹگمری گیا ہے۔ ان کے جانے کی وجہ یہ معلوم ہوئی ہے کہ ان کا کوئی قریبی رشتہ دار جو مربعوں پر ہوتا ہے، بڑا سخت بیمار ہے۔"

بجا طور پر شک ہوتا تھا کہ یہ مزارعہ بچے کو ساتھ لے گیا ہے۔

میں نے جس اے ایس آئی کو ساہیوال کے اُس چک میں بھیجا تھا وہ خاصا ذہین تھا۔ تفتیش کے کام میں اپنی عقل آزادانہ استعمال کرتا تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ اِس مزارعہ کو شاملِ تفتیش کرے گا۔ میرے پاس ایک جونیئر سب انسپکٹر بھی تھا۔ اُسے تفتیش کے لئے جانا چاہیئے تھا لیکن اے ایس آئی جتنا عقلمند تھا، سب انسپکٹر اتنا ہی بیوقوف تھا۔ وہ ہندو تھا اور کسی ریاست کے مہاراجے کی سفارش سے اُسے ترقی ملی تھی۔

میرے ساتھ لپٹ گئی

یہ ایسی واردات تھی جس کی تفتیش کے لئے نہ کوئی بنیاد مل رہی تھی نہ کوئی راستہ نظر آتا تھا نہ کوئی سراغ ملتا تھا۔ میں شک اور شبے پر دماغ لڑا رہا تھا۔ البتہ شک اور شبے کی وجہ بڑی ٹھوس اور قابلِ اعتماد تھی۔ مشکل یہ تھی کہ کسی کے خلاف کوئی پختہ شہادت نہیں مل رہی تھی۔ میں ایذارسانی (تھرڈ ڈگری) کے ذریعے اقبالِ جرم کرانے کا قائل نہیں تھا لیکن میں نے اِس واردات کی تفتیش میں پکا ارادہ کر لیا کہ تمام مشتبہوں کو ایذارسانی کی مشین میں ڈال دوں گا اور اس عمل کو اُس حد تک لے جاؤں گا جہاں پتھر بھی پگھل جاتے ہیں۔

میں نے نسیم کے باپ کو ایک بار پھر بلایا اور اُس سے پوچھا کہ اُس کے گھر جو آدمی اُس سے ملنے آیا تھا اور دائی نے اس آدمی سے کہا تھا کہ وہ ماتم والے گھر گیا ہوا ہے، کیا وہ آدمی اُسے ملا تھا؟

"نہیں ملا" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "ماتم والے گھر کوئی آدمی مجھ سے ملنے نہیں آیا تھا۔"

یہ سُن کر میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ بچے کو اسی آدمی نے اُٹھایا ہے۔ یہ شک مجھے پہلے بھی تھا۔

میں نے نسیم کے باپ کو باہر بھیج دیا اور دائی کو بلایا۔ اُس کی

آنکھوں میں آنسو تھے۔ میرے سامنے آتے ہی اُس نے رو کر کہا کہ تھانیدار صاحب جی بچہ مل جائے گا یا نہیں؟ مجھے تو ایسے لگتا ہے جیسے کوئی ظالم میری گود سے بچے کو اُٹھا لے گیا ہو۔

میں نے اُسے کہا کہ وہ پورا بیان دے کہ بچہ کہاں تھا اور بچے کی ماں کہاں تھی۔ اُس نے وہی بیان دیا جو میں نسیم اور اُس کے باپ کی زبانی سُنا چکا ہوں۔ بیان سُن کر میں نے اُس پر جرح شروع کی۔ وہ تسلی بخش جواب دیتی رہی۔ میں نے اُس سے اُس آدمی کا حلیہ اور قد کاٹھ پوچھا۔ اُس نے قد لمبا بتایا لیکن حلیہ نہ بتا سکی۔ کہنے لگی کہ اُس نے کھیس اس طرح لیا ہوا تھا کہ صرف آنکھیں اور ناک کا کچھ حصہ نظر آتا تھا۔

رات جاگتے گزر گئی۔ میرا یہ مطلب پورا ہوتا نظر نہیں آتا تھا کہ بچے کا سراغ مل جاتے اور اسے میں قتل ہونے سے بچا لوں۔ صبح یہ اُمید ختم ہو گئی۔ بچہ جس کسی کے پاس تھا اُس نے پولیس کو دیکھ کر بچے کا گلا دبا کر کہیں دفن کر دیا ہو گا۔ اُمید کی صرف یہ کرن ابھی موجود تھی کہ اے ایس آئی مربعوں پر گیا ہوا تھا۔ میرے دل سے دُعا نکلی کہ بچہ وہاں پہنچا دیا گیا ہو اور میرا اے ایس آئی پہنچ گیا ہو۔

میں صبح سویرے ابھی سورج نہیں نکلا تھا، مشتبہوں کی خاصی تعداد کو ساتھ لے کر تھانے میں آ گیا۔ ان میں بڑی چوہدرانی کے بھائی بھی تھے۔ میں نے ان سب کو اکٹھا کر کے کہا کہ میں آدھا گھنٹہ وقت دیتا ہوں۔ بچہ جس کے پاس ہے یا جس کسی کو بچے کی خبر ہے۔ وہ بتا دے۔ اُس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہو گی۔ آدھے گھنٹے کے بعد میں کسی کی کوئی بات نہیں سنوں گا۔ انہیں یہ وارننگ دے کر میں نے جونیئر سب انسپکٹر اور ہیڈ کانسٹیبلوں سے کہا کہ ان کی ہڈیاں بھی ٹوٹ جائیں تو پرواہ نہیں۔ مجھے ان میں سے کسی کا اقبالی بیان چاہیئے۔

میں اپنے گھر چلا گیا اور سو گیا۔ زیادہ دیر نہ سویا۔ دو گھنٹے بعد تھانے میں آ گیا اور مشتبہوں کی چیخیں سُنیں۔ ہیڈ کانسٹیبل ایذارسانی کے کام

ہیں لگے ہوتے تھے۔ واردات اس نوعیت کی تھی کہ تفتیش کے لئے یہ طریقہ ضروری تھا۔

وہ دن گزر گیا۔ رات بھی گزر گئی۔ مخبر اپنی رپورٹیں دیتے رہے۔ ان میں سے ایک بھی رپورٹ میرے کام نہیں آ سکتی تھی۔ مجھے بچّے کا کوئی سراغ درکار تھا جو نہیں مل رہا تھا۔ تھانے میں اور کئی کام تھے۔ اگلا دن اس مصروفیت میں گزر رہا تھا کہ ایک گاؤں کا نمبردار دو آدمیوں کو ساتھ لئے تھانے میں آیا۔

"ان دونوں نے ایک بچّے کی لاش دیکھی ہے" — نمبردار نے کہا۔

"عمر کیا ہے؟" — میں نے اُس کی پوری بات سُننے سے پہلے بیتابی سے پوچھا۔

"وہ تو کچھ دنوں کا لگتا ہے جناب!" — ایک آدمی نے کہا — "چہرہ بالکل ٹھیک ہے۔ ہاتھ اور بازو ٹھیک ہیں۔ دونوں پاؤں اور گھٹنوں تک ٹانگیں کھائی ہوئی ہیں"۔

"وہی ہے" — میرے مُنہ سے بے اختیار نکلا۔

دونوں آدمیوں نے مجھے جو تفصیل دی وہ یوں تھی کہ جس جگہ بچّے کی لاش پائی گئی تھی وہ اُس نشیب کے بالکل قریب تھی جس میں بچّے کا باپ چوہدری شاہباز قتل ہُوا تھا۔ وہ بنجر اور ویران علاقہ تھا۔ یہ دو آدمی راستہ چھوٹا کرنے کے لئے وہاں سے گزر رہے تھے۔ انہوں نے ایک کھڈ میں ایک اُودھ بلاؤ اور ایک نیولے کو کچھ کھاتے دیکھا۔ دونوں آپس میں لڑتے بھی تھے۔ دونوں آدمیوں نے ان کی طرف دیکھا تو رُک گئے، کیونکہ وہ جس چیز کو کھا رہے تھے وہ بہت چھوٹی چھوٹی انسانی ٹانگیں تھیں۔ ناف تک دھڑ نظر آ رہا تھا۔ دونوں آدمیوں نے پتھر مارے تو اُودھ بلاؤ اور نیولا بھاگ گئے۔

یہ آدمی کھڈ میں گئے تو انہیں ایک بچّے کی لاش دکھائی دی جس

کا ناف سے نیچے تک کا دھڑ باہر تھا، اُوپر کا دھڑ زمین میں دبا ہُوا تھا۔ لاش کی دونوں ٹانگیں اُودھ بلاؤ اور نیولا کھا رہے تھے۔ ایک آدمی وہیں کھڑا رہا اور دوسرا ساتھ والے گاؤں سے نمبردار کو بلا لایا۔ اس طرح لاش کی اطلاع مجھ تک پہنچی۔

میں ایک منٹ ضائع کئے بغیر ان کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ مجھے بغیر دیکھے یقین آ رہا تھا کہ یہ نسیم کا بچہ ہے۔ دیہات میں ایسی واردات کبھی نہیں ہوتی تھی کہ غیر شادی شدہ لڑکی نے ناجائز بچّے کو جنم دیا ہو اور اسے مار کر کہیں دفن کر دیا ہو۔

میں موقعہ پر پہنچا تو قریبی گاؤں کے بہت سارے آدمی کھڈ پہ کھڑے لاش کو دیکھ رہے تھے۔ پولیس کو دیکھ کر سب دُور ہٹ گئے۔ میں نے لاش کو اُسی حالت میں دیکھا جو مجھے سنائی گئی تھی۔ نمبردار اور ان آدمیوں نے لاش کو چھیڑا نہیں تھا۔ مٹی تازہ کھُدی ہوئی تھی جو اُودھ بلاؤ اور نیولے نے کھودی تھی۔ اگر بہت وقت پہلے لاش ننگی ہو جاتی تو گیدڑ اور گدھ پہنچ جاتے پھر لاش کی ہڈیاں ہی ملتیں اور اس کی شناخت نہ ہو سکتی۔ دونوں ٹانگوں سے کچھ گوشت کھایا گیا تھا۔

میں نے لاش کے اُوپر کے دھڑ سے مٹی ہٹوائی اور لاش کو کپڑے سے صاف کروایا۔ اُوپر کا دھڑ بالکل صحیح تھا۔ چہرہ تو اتنا صحیح تھا جیسے بچّہ سویا ہُوا ہو۔ بچّے کی عمر چند دن تھی۔ موسم سردی کا تھا اس لئے لاش ابھی خراب ہونا شروع نہیں ہوتی تھی۔ لاش پر کوئی کپڑا نہیں تھا۔ گلے میں کالی ڈوری کے ساتھ کپڑے میں سِلا ہُوا تعویذ بندھا ہُوا تھا۔

میں نے عجیب چیز دیکھی۔ لاش کے سینے کو درمیان سے دائیں اور بائیں کاٹا ہُوا تھا اور بائیں طرف نیچے والی آخری پسلی کے قریب بھی زخم تھا۔ سینے کے گھاؤ میرے لئے عجیب تھے۔ میں انہیں سمجھ نہ سکا۔

میں نے ایک کانسٹیبل کو نسیم کے گاؤں کو دوڑایا کہ وہ نسیم کے باپ کو بلا لائے۔ میں لاش کی برآمدگی کی کاغذی کارروائی میں مصروف ہو گیا۔

نسیم کا گاؤں بہت دُور نہیں تھا۔ میری کارروائی مکمل ہوتی ہی تھی کہ نسیم کا باپ آگیا۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ نسیم بھی ساتھ تھی۔ نسیم کی ماں اور دونوں بھائی بھی ساتھ تھے۔ نسیم کی زچگی کے ابھی چالیس دن پورے نہیں ہوتے تھے لیکن وہ ماں تھی۔ بچے کا سُن کر رہ نہ سکی۔ اُس کے باپ نے عقل مندی کی تھی کہ گاؤں سے کسی کی گھوڑی مانگ لی تھی اور نسیم کو اُس پر سوار کرا کے لایا تھا۔

میں وہ منظر الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا کہ بچے کو دیکھ کر نسیم کی کیا حالت ہوتی۔ میرے جیسا مضبوط آدمی بھی ہل گیا۔ نسیم اور اُس کے ماں باپ نے لاش کو فوراً پہچان لیا تھا۔ نسیم تو اپنے مُردہ بچے پر گر پڑی اور اُس کا منہ چُومنے لگی اور ایک طرف لڑھک گئی۔ اُس کا رنگ اپنے بچے کی لاش جیسا ہو گیا اور آنکھیں اُدھ کھُلی رہ گئیں۔ اُس پر غشی طاری ہو گئی تھی۔ یہ میرے لئے ایک اور مسئلہ بن گیا۔ شہر ہوتا تو میں اُسے فوراً ہسپتال پہنچاتا۔ اس جنگل بیابان میں یہی ہو سکتا تھا کہ میں نے قریبی گاؤں کو ایک آدمی کو دوڑایا کہ پانی اور دُودھ لے آئے۔

نمبردار سے کہا کہ کسی سے کہے کہ لاش قصبے کے سِول ہسپتال تک پہنچائے۔ اکیس دنوں کے بچے کی لاش کے لئے چارپائی کی ضرورت نہیں تھی۔ ہاتھوں پر لاش اُٹھائی جا سکتی تھی۔ نمبردار کے کہنے پر ایک آدمی نے لاش چادر میں لپیٹ کر ہاتھوں پر اُٹھالی۔ دو اور آدمی اس کے ساتھ کر دیئے گئے اور ایک کانسٹیبل بھی لاش کے ساتھ گیا۔

لاش چلی گئی۔ چند منٹ بعد پانی آنے سے پہلے ہی نسیم ہوش میں آگئی اور بڑی تیزی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ وہ اپنے بچے کو ڈھونڈ رہی تھی۔ میں برداشت نہ کر سکا اور وہاں سے چل پڑا۔ وہ دوڑتی آئی اور ——
"میرا بچہ۔ میرا بچہ" —— پکارتی میرے ساتھ لپٹ گئی۔ اُس کے دونوں بھائی اور باپ دوڑتے آئے اور اُسے مجھ سے الگ کیا۔ میرے لئے یہ صورتِ حال جذباتی لحاظ سے بہت ہی تکلیف دہ تھی۔ اگر میرا بس چلتا تو میں اس بچے

کے قاتلوں کو اپنے ہاتھوں گولی مارتا۔ میں وہاں سے اور تیز چل پڑا۔ دُور تک مجھے نسیم کی چیخیں سنائی دیتی رہیں۔ مجھ میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ میں پیچھے مُڑ کر دیکھتا۔

سکندر اور بڑی چوہدرانی

میں تھانے پہنچا تو سب سے پہلے یہ پوچھا کہ کسی مُشتبہ نے اقبالِ جرم کیا ہے یا نہیں۔ مجھے وہی پہلے والا جواب ملا کہ ابھی تک کسی نے بھی اقبالِ جُرم نہیں کیا۔

"ڈھیل مت چھوڑو" —— میں نے کہا —— "انہیں زندہ رہنے کے قابل نہ چھوڑو...... دیکھنا، کوئی مر نہ جائے۔ کوئی بے ہوش ہو جائے تو اُسے اُٹھا کر باہر پھینک دو۔"

بچے کی لاش پوسٹ مارٹم کے لئے چلی گئی تھی۔ قصبے میں سرکاری ہسپتال تھا جس میں ایک تجربہ کار ایم بی بی ایس ڈاکٹر تھا۔ پوسٹ مارٹم اسی ہسپتال میں ہو جاتا تھا۔ لیبارٹری ٹسٹ وغیرہ کی ضرورت ہوتی تو یہ ضرورت لاہور میں پوری ہوتی تھی۔

مَیں سورج غروب ہونے کے وقت گھر چلا گیا۔ ابھی میں وردی اُتار ہی رہا تھا کہ ایک کانسٹیبل آگیا۔ اُس نے بتایا کہ ساہیوال کے چک سے اے ایس آئی واپس آگیا ہے۔ کانسٹیبل نے یہ بھی بتایا کہ اے ایس آئی چوہدری سکندر، بڑی چوہدرانی اور اُس کی نوکرانی کو ساتھ لایا ہے۔ میں نے کانسٹیبل کو یہ کہہ کر بھیج دیا کہ مَیں آتا ہوں۔

مَیں ڈیڑھ دو گھنٹے بعد تھانے گیا۔ سب سے پہلے اے ایس آئی کو اپنے دفتر میں بٹھا کر رپورٹ لی کہ اُس نے وہاں کیا کارروائی کی ہے۔ اُس نے تفصیلی رپورٹ دی جو مختصراً یوں ہے کہ اُس چک کے علاقہ تھانیدار نے اُس کی بہت مدد کی تھی۔ اُس نے اپنا ایک اے ایس آئی، ایک

ہیڈ کانسٹیبل اور دو تین کانسٹیبل میرے اے ایس آئی کو دے دیتے تھے۔ ان سب نے اُس گھر پر جہاں چوہدری سکندر اور بڑی چوہدرانی ٹھہرے ہوتے تھے اور چوہدری شاہباز مقتول کے تمام مزارعوں کے گھروں پر چھاپے مارے اور وہاں خاصا اُدھم برپا کیا۔ وہاں کے مخبروں وغیرہ کو بھی استعمال کیا لیکن بچے کا کوئی سراغ نہ ملا۔

واردات والے گاؤں سے چوہدری شاہباز کا ایک مزارعہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ بچے کی گمشدگی کی شام اس چک کو روانہ ہوا تھا۔ میں نے اے ایس آئی سے اس کے متعلق پوچھا تو اس نے بتایا کہ اُس نے اس مزارعہ کو بھی شاملِ تفتیش کر لیا تھا۔ اس مزارعہ نے چک میں جانے کی یہ وجہ بتائی تھی کہ اُس کا ایک قریبی رشتہ دار شدید طور پر بیمار تھا۔ اے ایس آئی نے دیکھ لیا کہ اُس کا رشتہ دار واقعی بیمار تھا۔

مختصر یہ کہ اے ایس آئی نے میری توقع کے مطابق اپنا کام تندہی اور خوش اسلوبی سے کیا تھا۔ اُس نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، لیکن بچے کا کوئی سراغ نہ ملا۔ وہ سکندر اور بڑی چوہدرانی کو شاملِ تفتیش کرنے کے لئے ساتھ لے آیا تھا۔ میں نے اے ایس آئی کو اُٹھا کر چوہدری سکندر کو بلایا۔

"ملک صاحب!" ــــ سکندر نے اندر آتے ہی کہا ــــ "آپ کے چھوٹے تھانیدار صاحب نے چک میں جا کر ہمارے مزارعوں کے سامنے ہماری بہت بے عزتی کی ہے۔ ہمیں یہ سزا کس گناہ کی دی گئی ہے؟"

"سزا تو ابھی شروع ہی نہیں ہوئی چوہدری صاحب!" ــــ میں نے کہا ــــ "یہ تو تفتیش ہے۔"

"یہ تو ہمیں وہاں پتہ چلا ہے کہ چوہدری شاہباز کا نومولود بچہ اغوا ہو گیا ہے" ــــ سکندر نے کہا ــــ "میں تو واپس آنے والا تھا کہ اتنے میں چھوٹے تھانیدار صاحب پہنچ گئے۔ میں نے اُنہیں بھی کہا کہ مجھے گاؤں جانے دیں، میرے مرے ہوئے بھائی کا بچہ گم ہو گیا ہے لیکن چھوٹے

تھانیدار صاحب نے میری ایک بھی نہ سُنی۔"

وہ غصے میں تھا اور شکایت کے لہجے میں بول رہا تھا۔ میں نے اُسے ابھی یہ نہ بتایا تھا کہ بچے کی لاش مل گئی ہے۔

"میں تمہاری ہر بات سنوں گا چوہدری!" ــــ میں نے کہا ــــ "لیکن پہلے میری سُن لو۔ ابھی کیس میرے ہاتھ میں ہے۔ اگر بچہ واپس دے دیتے ہو تو تمہارے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہو گی۔"

وہ میری پوری بات سُنے بغیر تڑپنے لگا۔ وہ اُچھل اُچھل کر انکار کر رہا تھا۔ بار بار یہی کہتا تھا کہ میں اپنے بڑے بھائی کے بچے کو بھلا غائب کر سکتا ہوں؛ میں اُس کے انکار کو نہیں مان رہا تھا۔

"تم نسیم کے ساتھ شادی کرنا چاہتے تھے" ــــ میں نے کہا ــــ "نسیم نے انکار کر دیا تھا۔"

"ہاں!" ــــ اُس نے کہا ــــ "سچ ہے۔ یاد کریں ملک صاحب! میرے بھائی کے قتل کی آپ تفتیش کر رہے تھے تو میں نے آپ کو اپنا یہ ارادہ بتایا تھا کہ نسیم کے بیٹا ہوا تو میں نسیم کو باہر نہیں جانے دوں گا۔ اس کے ساتھ شادی کروں گا اور اپنے بھائی کی ساری جائیداد اُس کی پہلی بیوی کا حصہ الگ کر کے بھائی کے بیٹے کے نام کر دوں گا۔"

"تم نے نسیم کو یہ دھمکی بھی دی تھی کہ اس گھمنڈ میں نہ رہنا کہ تم نے جائیداد کا وارث پیدا کیا ہے" ــــ میں نے اُسے یاد دلایا ــــ "تم نے کہا تھا کہ زمین کا ایک انچ بھی نہیں لے سکو گی۔"

"ہاں جی!" ــــ اُس نے بڑی دلیری سے کہا ــــ "میں نے اُسے اس سے بھی سخت دھمکیاں دی تھیں۔ اگر جناب اجازت دیں تو میں ساری دھمکیاں سُنا دیتا ہوں۔"

"کیا تم اُسے اُس کے گھر جا کر دھمکیاں دیا کرتے تھے؟" ــــ میں نے اُس کے جھوٹ اور سچ کو پرکھنے کے لئے پوچھا۔

"صرف ایک بار اُس کے گھر جا کر" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "اور

اس کے بعد ایک عورت کی زبانی پیغام بھیجتا رہا۔ جناب حکم دیں گے تو اس عورت کو پیش کر دوں گا اور اُسے کہوں گا کہ وہ میری زبان سے نکلا ہُوا ایک ایک لفظ آپ کو سنائے۔ مجھے یاد تو نہیں لیکن میں نے غصّے میں یہ بھی کہا ہو گا کہ میں تمہارے اس جائیداد کے وارث کو گم کر دوں گا۔ توبہ توبہ ملک صاحب! میں اپنے بھائی کی نشانی کو غائب کر سکتا ہوں؟"

"تم غصّے میں تھے چوہدری سکندر!" —— مَیں نے کہا —— "ایک تو تمہارے بھائی کی جائیداد تمہارے ہاتھ سے جا رہی تھی اور نسیم جیسی خوبصورت اور جوان لڑکی بھی تمہارے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ تمہارے پاس انتقام کا یہی ایک طریقہ تھا، تم نے بچّے کو اغوا کرا دیا۔"

"بچّے کا الزام بار بار نہ لگائیں ملک صاحب!" —— اُس نے کہا —— "آپ حاکم ہیں۔ آپ کی عزّت کرنا میرا فرض ہے لیکن آپ اتنا ذلیل الزام لگاتے چلے جائیں گے تو میں گستاخی کر بیٹھوں گا اور اس گستاخی کی سزا کی پرواہ نہیں کروں گا.... میں آپ کو یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ میں نے نسیم کے باپ کو بھی دھمکیاں دی تھیں۔ میں نے اُسے کہا تھا کہ وہ ایسا خیال دل سے نکال دے کہ اُس کی بیٹی کے بیٹے کو جائیداد میں سے کچھ ملے گا۔"

وہ بڑی دلیری اور جرأت سے وہ تمام دھمکیاں مجھے سنا رہا تھا جو اُس نے نسیم اور اُس کے باپ کو دی تھیں۔

"ملک صاحب!" —— اُس نے کہا —— "آپ بھی ہم جیسے انسان ہیں اور ہماری طرح ہر ذات کے لوگوں میں رہتے ہیں۔ ہماری طرح آپ کی ذات بھی اونچی ہے۔ میری ایک بات پر تھانیداری کو الگ رکھ کر غور کریں۔ نسیم نیچ ذات کی لڑکی نہیں۔ اُس کی ذات ہم سے ایک درجہ کم ہے۔ اُس کا خاندان ہماری طرح بڑا زمیندار خاندان نہیں۔ یہ تو میرے بھائی شاہباز کے دل کا فیصلہ تھا کہ وہ اس لڑکی کو بیوی بنا کر اپنے اتنے اُونچے خاندان میں لے آیا تھا۔ اب نسیم کی شادی اتنے اُونچے خاندان میں

نہیں ہو گی۔ شاید فیروز کے ساتھ اُسے بیاہ دیں۔ کیا یہ ہمارے لئے بے عزّتی کا باعث نہیں کہ لوگ کہیں گے کہ یہ چوہدری شاہباز کی بیوی تھی؟ یہ سوچ کر میرے دل پر چھُریاں چلتی ہیں۔ یہی سوچ کر میں نے کہا تھا کہ نسیم کو میں اپنی بیوی بنا لوں گا۔ اس طرح خاندان کی عزّت خاندان میں رہے گی۔ آپ کا یہ کہنا غلط ہے کہ مَیں نسیم کی خوبصورتی اور جوانی کی وجہ سے اُس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا۔"

دیہاتی معاشرے کی اقدار کے پیشِ نظر اُس نے یہ بات بالکل ٹھیک کہی تھی لیکن میرا مسئلہ پھر بھی وہیں کا وہیں تھا۔ شادی کرنے کی وجہ خواہ کچھ ہی تھی، مسئلہ یہ تھا کہ نسیم نے شادی سے انکار کر دیا تھا اور اُس نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وہ جائیداد میں سے بچّے کا حصّہ ضرور لے گی جو بہت زیادہ بنتا تھا۔ میں کہتا تھا کہ بچّے کے اغوا اور قتل کا باعث یہی تھا۔

"کیا آپ یہ نہیں سوچتے ملک صاحب!" —— چوہدری سکندر نے کہا —— "کہ مَیں بچّے کے گم ہو جانے سے دو دن پہلے گاؤں سے اتنی دُور چلا گیا تھا؟"

"بچّے کو تم نے نہیں اٹھایا" —— مَیں نے کہا —— "تم نے اٹھوایا ہے .... جس سے اُٹھوایا ہے اُس کا نام بتا دو۔"

"آپ مجھے گاؤں میں جانے دیں ملک صاحب!" —— اُس نے کہا —— "وہیں بچّے کو ڈھونڈوں گا۔"

"کہاں ڈھونڈو گے چوہدری!" —— مَیں نے کہا —— "بچّے کی لاش ملی ہے.... لاش ہسپتال گئی ہوئی ہے۔"

"نہیں" —— اُس نے آگے ہو کر بڑی زور سے کہا —— "نہیں ملک صاحب!.... میرے بھائی کی نشانی.... میرے بھائی کا وارث...."

اُس کی آواز دب گئی اور اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

پہلے تو سسکیاں لے رہا تھا پھر اُس کی ہچکیاں نکلنے لگیں۔ وہ ایکٹنگ نہیں کر رہا تھا۔ اُس کے رونے میں بناوٹ نہیں تھی۔

"ملک صاحب!" — اُس نے بچّوں کی طرح روتے ہوئے کہا — "مجھے جانے دیں۔ اگر آپ کو قاتل نہیں مل رہا تو اُسے میں ڈھونڈ لوں گا اور خود تھانے میں حاضر ہو کر بتاؤں گا کہ قاتل کی لاش فلاں جگہ پڑی ہوئی ہے۔"

میں نے اس شک کو ذہن سے نکالا نہیں کہ اِس نے بچّے کو اٹھوایا ہے اور چونکہ میں نے گاؤں میں جا کر کئی گھروں کی تلاشی لی اور کئی مشتبہ اکٹھے کر لئے تھے اس لئے بچّہ جس کے پاس تھا وہ ڈر گیا اور اُس نے بچّے کو مار ڈالا اور لاش گاؤں سے دُور جا کر دفن کر دی۔ اِس شک کے ساتھ ہی ساتھ میں یہ بھی محسوس کرنے لگا تھا کہ سکندر نے بچّہ نہیں اٹھوایا۔

"چوہدری سکندر!" — میں نے کہا — "میں تمہیں اور بڑی چوہدرانی کو گھر نہیں جانے دوں گا۔ صبح تک سوچ لو۔ اس کے بعد مُہلت نہیں دُوں گا۔"

دِل نکال لیا

اُس نے بہت احتجاج کیا، بہت شور مچایا، میری مِنت بھی کی۔ مَیں نہیں مانا اور اُسے کانسٹیبلوں کے حوالے کر دیا۔ مشتبہوں میں بڑی چوہدرانی کو مَیں عورت ہونے کی وجہ سے کمزور سمجھتا تھا۔ مجھے اُمید تھی کہ وہ ڈر کر کوئی سراغ دے دے گی۔ اُس کی نوکرانی گُلی بھی تھی۔ مجھے شُبہ تھا کہ اس سے بچّہ اٹھوایا گیا ہوگا۔

اتنے میں پوسٹ مارٹم رپورٹ آ گئی۔ عجیب رپورٹ تھی۔ مَیں تو چکرا گیا۔ مَیں نے لاش کے سینے پر لمبے زخم دیکھے تھے اور ایک زخم بائیں طرف والی آخری پسلی کے نیچے تھا۔ ڈاکٹر نے لکھا تھا کہ لاش کی دائیں اور بائیں طرف والی پسلیوں میں سے درمیان والی ایک ایک پسلی کاٹ کر نکالی گئی ہیں اور لاش کا دل بھی نکالا گیا ہے۔ یہ درندوں کا کام نہیں تھا۔ درندے صرف دو پسلیاں کاٹ کر دل نہیں نکال سکتے تھے۔ نہ وہ اتنی صفائی

سے دل نکال لیتے۔ وہ پورے سینے کا گوشت کھاتے۔ پیٹ پھاڑ کر کھاتے۔ اُدھر بلاؤ اور نیولے نے ٹانگوں کا گوشت کھایا تھا۔ دیکھنے والا ہر آدمی کہہ سکتا تھا کہ یہ گوشت خور جانوروں نے کھایا ہے۔

مَیں نے تفتیش صبح تک ملتوی کر دی۔ پہلے مَیں تفتیش میں ایک منٹ کا بھی وقفہ نہیں ڈالنا چاہتا تھا کیونکہ میری کوشش تھی کہ بچّے کو زندہ برآمد کروں لیکن اب معاملہ کچھ اور ہو گیا تھا۔ میں نے سب کو تھانے میں ہی روکے رکھا۔ تھانے میں اس طرح پابند رہنا بھی ان لوگوں کے لئے اچھی خاصی اذیت کا باعث تھا۔

میں اگلی صبح تھانے میں آیا۔ پہلا حکم یہ جاری کیا کہ ایذا رسانی کچھ دیر تک روک لی جائے۔ پھر میں نے چوہدری سکندر کو بلایا اور اُس سے پوچھا کہ اُس نے کیا سوچا ہے۔ جواب میں اُس نے پھر تڑپنا شروع کر دیا۔ میں نے اُسے وہیں بٹھا دیا جہاں اُس نے رات گزاری تھی۔ میرے ذہن پر اُس وقت لاش کی پوسٹ مارٹم رپورٹ سوار تھی۔ میں ہسپتال ڈاکٹر کے پاس چلا گیا اور اُس سے پوچھا کہ لاش کے سینے کے نیچے کے زخموں کے متعلق اُس کی رائے کیا ہے اور کیا یہ زخم درندوں کے ہو سکتے ہیں؟

"نہیں" — اُس ہندو ڈاکٹر نے جواب دیا — "درندے اتنی صفائی سے جسم کا کوئی حصّہ الگ نہیں کیا کرتے۔ سینے سے دو پسلیاں انسانی ہاتھوں سے نکالی گئی ہیں۔ اس کام کے لئے چھُری یا چاقو یا اوزار استعمال کیا گیا ہے۔ دل بھی پیٹ کو چھُری یا چاقو سے کاٹ کر بڑی صفائی سے نکالا گیا ہے۔"

"ایسے کام تو کالا عمل کرنے والے کیا کرتے ہیں" — میں نے کہا۔

"ہاں" — ڈاکٹر نے کہا — "لگتا ایسا ہی ہے۔ اس کے سوا مجھے کوئی اور مقصد سمجھ نہیں آ رہا... کیا آپ کو معلوم ہے کہ بچّے کی عمر کتنی تھی؟"

"اکیس دن" — میں نے جواب دیا — "بچّہ اکیسویں دن اغوا ہوا تھا۔"

"پھر یہ کالا عمل کیا گیا ہے" — ڈاکٹر نے میز پر ہاتھ مار کر کہا —

"میں نے ایسے کیس پہلے بھی سُنے ہیں۔ اکیس دنوں کا بچہ اس عمل میں عموماً استعمال ہوتا ہے۔"

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ ایسا عمل کس مقصد کے لئے کروایا جاتا ہے؟" — میں نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

"اولاد کے لئے!" — ڈاکٹر نے جواب دیا — "اکیس دن عمر کے علاوہ ایسے بچے کی کچھ اور نشانیاں بھی ہوتی ہیں۔ اُس کی پیدائش کسی خاص دن کی ہوتی ہے۔"

اس مسئلے پر ڈاکٹر کے ساتھ کچھ دیر تبادلۂ خیال ہُوا اور میں وہاں سے آ گیا۔ میں نے خود بھی کالے علم کی۔ جسے کالا جادو بھی کہا جاتا ہے، بہت سی باتیں سُنی تھیں۔ ڈاکٹر نے چند ایسی باتیں بتائیں جو میں نے پہلے نہیں سُنی تھیں۔ آج کل تو ٹسٹ ٹیوب بچے بھی پیدا ہونے لگے ہیں۔ اگر خاوند پیدائشی طور پر اولاد پیدا کرنے کے قابل نہ ہو اُس کا بھی علاج ہو سکتا ہے۔ میں جس وقت کی واردات سُنا رہا ہوں اُس وقت ایسے علاج موجود نہیں تھے۔ دیہات میں آج بھی لوگ اولاد کے لئے پیروں اور عاملوں کی مدد حاصل کرتے ہیں اور ٹونوں ٹوٹکوں کا سہارا لیتے ہیں۔ پیروں اور عاملوں وغیرہ کی منڈی ایسے ہی پسماندہ اور حاجت مند لوگوں کی وجہ سے چمک رہی ہے۔ کالا جادو تو آج بھی پوری آب و تاب کے ساتھ ہمارے صرف دیہاتی ہی نہیں بلکہ شہری معاشرے میں بھی استعمال ہو رہا ہے۔

میں اگر بتانے لگوں کہ ہمارے لوگ اولاد کی خاطر کیسے کیسے عمل کرتے ہیں تو بعض حضرات شاید یقین نہ کریں۔ یہ ٹونہ تو عام ہے کہ بے اولاد عورت مرے ہوئے سانپ کے اُوپر لوٹا اُلٹا رکھ کر اور اس لوٹے پر بیٹھ کر نہاتی ہے۔ ہندوستان کے بعض علاقوں میں بے اولاد عورت کو کسی نوزائیدہ بچے کا خون ایک خاص مقدار میں پلایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لئے کسی نوزائیدہ بچے کو اغوا کیا جاتا ہے۔

میں نے ایک بڑا ہی بھیانک کیس دیکھا ہے۔ یہ ایک واردات

تھی جو میرے ایک تھانیدار دوست کے پاس آئی تھی۔ واردات یہ تھی کہ ایک گاؤں میں ایک جوان آدمی مر گیا۔ آدھی رات کے وقت دو آدمی کہیں جاتے ہوئے قبرستان میں سے گزرے۔ چاندنی بڑی صاف تھی۔ اُنہوں نے کھُدی ہوئی ایک قبر دیکھی۔ وہ ابھی کچھ دُور ہی تھے کہ ایک آدمی قبر کے قریب سے اُٹھا اور دوڑ پڑا۔ قبر میں سے ایک عورت نکل رہی تھی کہ اتنے میں یہ آدمی اُس تک پہنچ گئے۔ انہوں نے عورت کو روک لیا اور پوچھا کہ وہ قبر میں کیا کر رہی تھی اور وہ آدمی کون ہے جو بھاگ گیا ہے۔

عورت نے پہلے تو کئی جھوٹ بولے لیکن ان آدمیوں نے دیکھ لیا کہ قبر میں میّت کفن میں لپٹی ہوئی پڑی ہے۔ اتنے میں وہ آدمی بھی واپس آ گیا جو بھاگ گیا تھا۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کر بیان کیا کہ یہ عورت اُس کی بیوی ہے۔ شادی کو آٹھ سال ہو گئے ہیں اور اولاد نہیں ہوتی۔ ایک عامل نے یہ ٹونہ بتایا ہے کہ کوئی جوان آدمی مر جائے تو عورت اُسی رات اُس کی قبر کھود کر میّت کے اُوپر لیٹے اور اُس کے ساتھ پیار محبت کرے۔

اس مقصد کے لئے میاں بیوی نے بڑی محنت سے قبر کھودی تھی۔ عورت قبر میں اُتر بھی گئی تھی لیکن یہ دو آدمی پہنچ گئے۔ میاں بیوی قریبی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ ان دو آدمیوں کے پاس کلہاڑیاں تھیں۔ وہ میاں بیوی کو اُن کے گاؤں میں لے گئے اور نمبردار کو جگا کر بتایا کہ دیکھو میّت کی کیا بے ادبی ہو رہی ہے۔ اس طرح انہیں تھانے پہنچا دیا گیا۔ تھانیدار نے انہیں لعنت ملامت کر کے چھوڑ دیا۔

ایسے اور بھی کچھ ٹونے ہیں جو لوگ کرتے ہیں۔ میں اپنی کہانی کی طرف آتا ہوں۔ واردات والے گاؤں میں ہی ایک ہندو عامل تھا جس کے متعلق مشہور تھا کہ کالے عمل کا ماہر ہے۔ میں اُسے بلانا چاہتا تھا تاکہ اُس کی بھی رائے لے لوں لیکن اس خیال سے اُسے بلانے کا ارادہ ترک کر دیا کہ یہ کام اسی کا نہ ہو۔ میں بڑی گہری سوچ میں چلا گیا۔ مجھے یقین ہونے لگا تھا کہ بچے کو کالے عمل کے لئے اغوا و قتل کیا گیا ہے۔ یہ تو

میرا اور ڈاکٹر کا خیال تھا کہ یہ عمل بے اولاد عورتوں کے لئے کیا جاتا ہے۔ اس کا کوئی اور مقصد بھی ہو سکتا تھا۔ بہرحال یہ بات طے شدہ تھی کہ بچے کو کسی اور مقصد کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ دو پسلیوں کا کاٹ کر نکالنا بے مقصد نہیں ہو سکتا تھا۔ دل بھی صفائی سے نکالا گیا تھا۔

تفتیش کی تو لائن ہی بدل گئی۔ اب میں نے یہ دیکھنا تھا کہ وہ کون بے اولاد ہے جس سے کسی کالے جادو والے عامل نے اتنا بھیانک عمل کروایا ہے۔ وہ کوئی اسی گاؤں کا ہو سکتا تھا۔ اُس کا سراغ لگانا تو کوئی مشکل نہیں تھا۔ میں نے اس پر غور کرنا شروع کر دیا۔ سوچتے سوچتے مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں گمراہ ہو گیا ہوں اور یہ کالا عمل محض وہم ہے لیکن میں نے ایسی باتیں سُنی بھی تھیں اور ایک دو کیس دیکھے بھی تھے۔ میں جُوں جُوں غور کرتا تھا مجھے یہ واردات پُراسرار ہی لگتی تھی۔

کچھ دُور کے ایک تھانے میں ڈکیتی کی واردات ہو گئی تھی۔ دو ملزم میرے علاقے میں رہتے تھے۔ اُن کی نشاندہی ہو گئی تھی۔ اتفاق سے اُسی روز واردات والے تھانے کا تھانیدار ملزموں کی گرفتاری اور خانہ تلاشی کے لئے آ گیا۔ اُسے میری مدد کی ضرورت تھی۔ وہ خوشاب کے علاقے کا رہنے والا ایک بہت بڑے زمیندار خاندان کا آدمی تھا۔ ان دنوں میں پولیس آفیسر ایسے ہی بڑے خاندانوں کے لئے جاتے تھے۔ انہیں روپے پیسے کا لالچ نہیں ہوتا تھا۔

وہ میرے پاس آیا۔ میں اُسے پہلے سے جانتا تھا۔ تھانے میں اُس کی خاطر تواضع کی۔ اپنا یہ بچے کے قتل والا کیس اُسے سنایا۔ لاش کی حالت بتائی اور یہ بھی بتایا کہ ڈاکٹر نے کیا رائے دی ہے۔

"ڈاکٹر نے ٹھیک کہا ہے" — اُس نے کہا — "اور تم بھی ٹھیک سوچ رہے ہو۔ اسے وہم نہ سمجھو" — اُس نے دو کیس سنا دیئے جن کا تعلق کالے علم کے ساتھ تھا۔ یہ سُنا کر اُس نے کہا — "یہ کام کسی معمولی آدمی کا نہیں۔ یہ کسی بڑے ہی امیر اور اثر و رسوخ والے زمیندار یا جاگیردار

یا کسی ہندو سیٹھ کا ہے۔ ہندوؤں اور سکھوں میں بھی ایسا کوئی آدمی ہو سکتا ہے۔ پہلے اپنے علاقے میں بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں میں دیکھو کہ ان میں بے اولاد کون ہے۔ میں بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں کی بات اس لئے کر رہا ہوں کہ اس کام میں پیسہ خرچ ہوتا ہے اور پیسہ اتنا زیادہ خرچ ہوتا ہے جو کوئی عام آدمی نہیں دے سکتا۔"

یہ سب انسپکٹر اپنے کام کا ماہر اور عقلمند آدمی تھا۔ میں نے اس کی بات مان لی یا آپ یوں سمجھیں کہ اُس نے تائید کر دی کہ میں نے تفتیش کو جس لائن پر ڈالا ہے وہ ٹھیک ہے۔ نمبردار تھانے میں موجود تھا۔ میں نے اُسے بلایا اور کہا کہ وہ اگر جانتا ہے تو بتا دے اور اگر نہیں جانتا تو شام سے پہلے پہلے اپنے گاؤں میں معلوم کر کے بتائے کہ بے اولاد کون ہے۔ میں نے اُسے ضروری باتیں بتائیں اور کہا کہ کسی بے اولاد کا سراغ لگانا کوئی مشکل کام نہیں۔ اولاد کے خواہشمند لوگ ہر کسی سے کسی پیر فقیر اور کسی مزار اور خانقاہ کا اتہ پتہ پوچھتے رہتے ہیں جہاں سے اُن کی مراد پوری ہو جاتی ہے۔

پھر میں نے اے ایس آئی اور جونیئر سب انسپکٹر اور دو ہیڈ کانسٹیبلوں کو بلا کر یہ مسئلہ سنایا اور کہا کہ مخبروں کو اس کام پر لگا دیں۔

میں نے مشتبہوں کی ایذا رسانی رکوا دی تھی۔ اب ان سب کو ایک جگہ بٹھانے کے لئے کہہ دیا۔ میں انہیں ابھی چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ چوہدری سکندر منت کر رہا ہے کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں نے اُسے بلا لیا۔ اُس نے آتے ہی کچھ غصے اور کچھ درخواست کے لہجے میں کہا کہ میں اُسے جانے کی اجازت دے دوں۔ وہ بہت بھڑکا ہوا تھا۔ کہتا تھا کہ وہ اپنے بھائی کے بچے کے قاتل کو تلاش کر لے گا۔ میں نے اُسے بتایا کہ ابھی میں اُسے جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ میں نے اُسے تسلی دی کہ قاتل مل جائے گا پھر اُس سے پوچھا کہ اُس کے گاؤں میں کوئی بے اولاد آدمی ہے؟ میں

نے یہ بھی کہا کہ وہ آدمی امیر کبیر ہو گا۔ اُس نے مجھ سے اس مسئلے پر سوال جواب شروع کر دیے۔ میں نے اُسے اصل بات تو نہ بتائی، ویسے کچھ اشارے دے دیتے۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"ایک بات بتاؤ" — میں نے پوچھا — "تمہارے گاؤں میں ایک ہندو عامل ہے۔ کیا وہ کالا عمل کرتا ہے؟"

"ہاں جناب!" — اُس نے جواب دیا — "وہ تو کرتا ہی کالا عمل ہے اور اس میں اُس کی بڑی شہرت ہے۔"

"کیا وہ بے اولاد عورتوں کو اولاد دینے کا کام بھی کرتا ہے؟"

"کرتا ہے" — اُس نے جواب دیا — "لیکن سُنا ہے کہ پیسے بہت زیادہ لیتا ہے جو ہر کوئی نہیں دے سکتا اور اس کے علاوہ سنا ہے کہ عمل ایسا بتاتا ہے کہ وہ بھی ہر کوئی نہیں کر سکتا.... مثال کے طور پر میں آپ کو بتاتا ہوں کہ آپ کو پتہ ہے کہ میرے بھائی چوہدری شاہباز کی بیٹیاں ہی بیٹیاں تھیں بیٹا نہیں ہوتا تھا۔ بھائی میرا اس پنڈت سے ملا۔ گاؤں میں سب اسے پنڈت کہتے ہیں۔ اس نے پہلی بات تو یہ کہی کہ سات آٹھ ہزار روپیہ وہ لے گا اور دوسری بات جو اُس نے اپنے عمل کے لئے بتائی وہ سُن کر میرے بھائی نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔"

"عمل کیا بتایا تھا؟"

"بڑا خوفناک عمل تھا ملک صاحب!" — سکندر نے جواب دیا — "کہتا تھا کہ کسی کا پہلوٹھی کا بچہ چاہیئے جس کی عمر اکیس دنوں سے زیادہ نہ ہو.... میرا بھائی وہاں سے بھاگ آیا۔ سات آٹھ ہزار روپیہ تو ہم دے سکتے تھے لیکن پہلوٹھی کا بچہ کہاں سے لاتے۔ وہ تو کسی کا بچہ اغوا کرنے والی بات تھی۔"

سکندر کی یہ بات سُن کر مجھے ایسے لگا جیسے اُس نے مجھے اندھیرے میں روشنی دکھا دی ہو۔ یہ ذہن میں رکھیں کہ میں جن وقتوں کی بات کر رہا ہوں اُن وقتوں کا سات آٹھ ہزار روپیہ آج کے ایک لاکھ روپے

کے برابر تھا بلکہ اس سے زیادہ سمجھ لیں۔

"آپ یہ باتیں مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟" — سکندر نے پوچھا — "اگر آپ کا کوئی ایسا کام ہے تو حکم کریں۔ میں اس پنڈت کے ساتھ بات کر دوں گا۔ روپے پیسے کی فکر نہ کریں۔ میں خود دے دلا لوں گا۔ آپ کام بتائیں۔"

یہ شخص مجھے رشوت پیش کر رہا تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میرا پنڈت کے ساتھ کوئی کام نہیں۔ مَیں نے اُسے یہ بھی بتایا کہ شاید اب بچے کا قاتل مل جائے گا۔ سکندر میری بات نہ سمجھ سکا۔ کہنے لگا کہ آپ پنڈت کے ساتھ بات کریں تو وہ معلوم کر لے گا کہ قاتل کون ہے۔

"میں نے تم سے کچھ اور پوچھا تھا" — مَیں نے کہا — "مَیں نے پوچھا تھا کہ کوئی ایسا آدمی ہے جو بے اولاد ہے اور اُس نے اس ہندو عامل سے کوئی عمل کروایا ہے؟"

سکندر میرے مُنہ کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس کے چہرے پر ایسے تاثرات آ گئے جیسے وہ میری بات سمجھ گیا ہو یا سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"مَیں ایک آدمی کو جانتا ہوں" — اُس نے بالکل ہی بدلے ہوئے لہجے میں کہا اور اپنے گاؤں سے تقریباً تین میل دُور کے ایک گاؤں کا اور وہاں کے ایک خاصے بڑے زمیندار کا نام لیا اور کہا — "میری اُس کے ساتھ بڑی اچھی سلام دُعا ہے۔ تقریباً ڈیڑھ مہینہ پہلے میں نے اُسے اس پنڈت کے گھر سے نکلتے دیکھا تھا۔ چونکہ وہ اتنی دُور سے میرے گاؤں میں آیا ہوا تھا اس لئے میں اُسے اپنے گھر لے گیا اور خاطر تواضع کی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ پنڈت کے پاس کیوں آیا ہے۔ اُس نے بتایا کہ شادی کر کے آٹھواں سال جا رہا ہے اور کوئی بچہ نہیں ہوا۔ کوئی پیر مرشد نہیں چھوڑا۔ بڑی دُور دُور مزاروں اور خانقاہوں پر گیا ہوں۔ اب کسی نے اس پنڈت کا بتایا ہے اور اس کے پاس آیا ہوں۔ کہتا ہے

کام ہو جائے گا۔"

"تم نے اُس سے پوچھا نہیں کہ پنڈت نے کیا عمل بتایا ہے؟"

"نہیں" — سکندر نے جواب دیا — "میں نے یہ بات نہیں پوچھی۔"

سوکن نہ لانے کی قسم کھالی

میرا دماغ اسی بڑے زمیندار پر اٹک گیا۔ میں نے مخبروں سے بھی رپورٹیں لینی تھیں۔ یہ زمیندار جس گاؤں کا رہنے والا تھا وہ گاؤں بھی میرے تھانے میں آتا تھا۔ اُس گاؤں کی زیادہ آبادی سکھوں کی تھی۔ وہاں بھی اپنے مخبر موجود تھے جن میں ایک سکھ ریٹائرڈ صوبیدار تھا۔ مخبری اُس کی ہابی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ پیدائشی مخبر ہو۔ تھانے والوں کو مخبری کے ذریعے خوش کر کے اُسے روحانی تسکین ہوتی تھی۔ میں نے اُسے بلایا۔

یہاں میں آپ کی دلچسپی کے لئے بتاتا ہوں کہ تفتیش تفتیشی افسر کی ذہانت اور عقل کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی لیکن مخبروں کے بغیر تفتیشی افسر کی ذہانت اور عقل کوئی کام نہیں کرتی۔ صرف پولیس کی تفتیش نہیں، ملٹری اور سول انٹیلی جنس کی کامیابی کے ضامن بھی مخبر ہی ہوتے ہیں۔ دنیا کا سب سے بڑا اور کامیاب جاسوسی اور تخریب کاری کا ادارہ امریکہ کی سی آئی اے ہے۔ اسے جدید سائنسی آلات کی مدد حاصل ہے لیکن اس کی کامیابی کا دارومدار انسانی مشینری پر ہے۔ اگر پاکستان میں سی آئی اے کو مقامی مخبر نہ ملیں تو یہاں سے یہ ادارہ بوریا بستر گول کر جائے۔

سکھ صوبیدار سائیکل پر آیا۔ سکھ دیسی شراب پیا کرتے تھے۔ تھانے میں دو سکھ کانسٹیبل تھے۔ میں نے انہیں پیسے دے کر کہا تھا کہ صوبیدار آئے تو اُسے ایک "پوا" (بڑی بوتل کا چوتھائی) پلا دیں اور ساتھ پکوڑے

کھلا دیں۔ وہ آیا تو دونوں سکھوں نے اُس کا استقبال کیا اور اُسے اپنے ساتھ لے گئے۔ وہ جب میرے پاس آیا تو اس کا موڈ جوبن پر تھا۔

میں نے اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اُس کے گاؤں کے اُس بڑے زمیندار کا نام لیا جس کا میں اُوپر ذکر کر آیا ہوں۔ اصل نام کی بجائے اس کے لئے افضل کا نام استعمال کروں گا۔ میں نے سکھ صوبیدار سے کہا کہ وہ مجھے اس شخص کے متعلق بتائے کہ وہ کیا چیز ہے اور کیسا آدمی ہے۔ صوبیدار نے اُس کا جو نقشہ پیش کیا وہ پورا نہیں سنا سکتا کیونکہ بہت لمبا چوڑا ہے۔ ہے تو دلچسپ لیکن میں اصل کہانی پر زیادہ توجہ دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ صوبیدار نے اُس کا حلیہ، اُس کا قد اور اُس کے جسم کی بناوٹ بھی سنائی تھی۔

میرے مطلب کی بات یہ تھی کہ اُس کی عمر بتیس سال کے لگ بھگ تھی اور اُس کا ابھی تک ایک بھی بچی یا بچہ نہیں ہوا تھا۔ اتنا امیر زمیندار تو اپنے آپ کو بادشاہ سمجھتا ہے، معمولی سے آدمی کی اولاد نہ ہو تو وہ دوسری شادی کر لیتا ہے۔ یہ شخص تو کسی سے پوچھے بغیر دوسری شادی کر سکتا تھا لیکن وہ اس بیوی کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا جس کی وجہ صوبیدار نے یہ بتائی کہ وہ اُس کی اپنی پسند کی شادی تھی۔ اس بیوی کے ساتھ اُس کی شادی سے پہلے معاشقہ چل رہا تھا۔ اس لڑکی کا رشتہ افضل کو نہیں مل رہا تھا۔ لڑکی نے ایسی جرأت دکھائی تھی کہ اُس نے اپنے والدین سے کہہ دیا کہ اُس کی شادی افضل کے ساتھ ہوگی۔ اگر کسی اور کے ساتھ شادی طے ہوئی تو وہ شادی والے دن کچھ کھا کر مر جائے گی۔ آخر اُس کی شادی افضل کے ساتھ کر دی گئی۔ اب افضل اُس کی محبت اور جرأت کی خاطر اُس پر سوکن نہ لانے کی قسم کھا چکا تھا۔

صوبیدار نے بتایا کہ افضل پیروں، عاملوں اور ہندو جوگیوں اور سنیاسیوں پر بے انداز دولت لٹا چکا تھا۔ اُس کے متعلق سکھ صوبیدار نے بتایا کہ وہ شریف آدمی نہیں۔ ہر طرح کی بدمعاشی اور غنڈہ گردی کر سکتا ہے

اور جہاں ضرورت پڑتی ہے وہ غنڈہ گردی کرتا ہے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ اُس نے رجسٹرڈ بدمعاشوں اور دو ڈکیتوں کو گھر سے دوست بنایا ہُوا ہے۔

میرے پوچھنے پر اُس نے ان رجسٹرڈ بدمعاشوں اور ڈکیتوں کے نام بتائے۔ اس سکھ صوبیدار سے میں نے اور بھی بہت کچھ پوچھا تھا۔ اُس نے ایسے جواب دیئے تھے جن سے مجھے اپنا کام آسان ہوتا معلوم ہُوا۔

"صوبیدار جی!" — میں نے اُسے کہا — "ایک کام کر دیں۔ خدا کی قسم، پولیس کپتان تک آپ کی سفارش کروں گا اور سند کے علاوہ نقد انعام دلاؤں گا .... کام یہ ہے کہ افضل، اس کی بیوی اور اس کے جو خاص وارداتیے بدمعاش ہیں، ان پر نظر رکھیں۔ ان میں سے کوئی چوہدری شاہباز مقتول کے گاؤں کی طرف آئے تو فوراً مجھے اطلاع دیں۔"

مجھے احساس تھا کہ صوبیدار کے لئے یہ کام آسان نہیں۔ وہ ہر وقت، خصوصاً رات کو کسی پر نظر نہیں رکھ سکتا تھا۔ میں نے اس کا یہ انتظام بھی کر دیا کہ جونیئر سب انسپکٹر سے کہا کہ وہ واردات والے گاؤں سے دو قابلِ اعتماد آدمی کل صبح بلا دے۔

رات خاصی گزر گئی تھی۔ میں نے سکھ صوبیدار کو رخصت کر دیا اور اپنے گھر چلا گیا۔

صبح میں تھانے گیا تو کچھ وقت بعد واردات والے گاؤں سے دو آدمی آ گئے۔ یہ میرے خاص مخبر تھے۔ میں نے انہیں کہا کہ وہ افضل کے گاؤں چلے جائیں اور سکھ صوبیدار سے ملیں۔ وہ انہیں افضل دکھائے گا اور افضل کے کچھ خاص آدمی دکھائے گا۔ ان کے چہرے یاد کر لیں۔ ان میں سے کوئی ان کے (واردات والے) گاؤں میں پنڈت (عامل) کے پاس آئے تو نمبردار کی گھوڑی پر یا سائیکل پر فوراً مجھے اطلاع دیں۔

"میں چوہدری افضل کو جانتا ہوں سرکار!" — میرے مخبروں میں سے ایک نے جس کا نام شانو تھا، کہا — "اُس کا ایک خاص آدمی کل پنڈت کے گھر آیا تھا۔ اُستاد وارداتیا ہے۔ اُس کا نام جمیل ہے اور

جمی کہلاتا ہے۔"

جمی کو میں بھی جانتا تھا۔ تین چار وارداتوں میں وہ مشتبہ رہا اور ہر بار کچھ دن اُسے تھانے میں رکھا تھا۔ وہ واقعی اُستاد تھا جو ہر بار میرے ہاتھ سے صاف بچ کر نکل گیا تھا۔ اُس کا جسم تو جیسے لوہے کا بنا ہُوا تھا۔ اتنی مار پٹائی گدھا کیا برداشت کرے گا گینڈا بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ میں نے اُسے تھانے بلانا تھا۔ اگر کانسٹیبل کو بھیجتا تو اُس کے گاؤں میں سب کو پتہ چل جاتا۔ افضل کو پتہ چلتا تو وہ کوئی پیش بندی کر لیتا۔ میں یہ فرض کر رہا تھا کہ جمی کو افضل نے پنڈت کے پاس بھیجا تھا۔ میں نے کانسٹیبل کو بھیجنے کی بجائے یہ انتظام کیا کہ شانو سے کہا کہ وہ جمی کے گاؤں جائے اور اُسے باتوں باتوں میں گاؤں سے باہر لے آئے۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ وہ شانو کے پیچھے پیچھے جائے اور گاؤں سے ذرا دُور کہیں چھُپ کر بیٹھ جائے۔ جمی آئے تو وہ اُسے پکڑ کر تھانے لے آئے۔

"صرف جمی کو نہیں سرکار!" — دوسرے مُخبر نے کہا — "اس طرح جمی، اس (شانو) کا دشمن بن جائے گا ہمیں تو ہر اچھے بُرے آدمی کے ساتھ دوستی رکھنی ہے۔ ہیڈ کانسٹیبل یوں کرے کہ اِن دونوں کو دیکھ کر اِنہیں گالیاں دینی شروع کر دے اور دونوں کو تھانے لے آئے۔ دونوں یہاں آئیں تو آپ ان پر حملہ کر دیں۔ اس کے بعد آپ جمی کو لپیٹ میں لے لیں۔ شانو جمی پر یہ ظاہر کرے گا کہ اسے بہت مار پڑی ہے بلکہ اسے آپ حوالات میں بند کر دیں۔"

اُن وقتوں کے جرائم پیشہ لوگ بہت عقل مند ہُوا کرتے تھے۔ اِس مُخبر نے جو بات سوچی تھی وہ میرے ذہن میں بھی نہیں آئی تھی۔ میں نے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو بلا کر اچھی طرح سمجھایا کہ شانو کیا کرے گا اور اُس نے کیا کرنا ہے۔

قمیض پھاڑ کر ننگی ہو گئی

شانو اور ہیڈ کانسٹیبل چلے گئے۔ انہیں کم و بیش تین میل دُور جانا تھا۔ اِن کا جو مشن تھا اس کے لئے تین یا چار گھنٹے درکار تھے۔ میں دوسرے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ اس دوران واردات والے گاؤں کا نمبردار میرے پاس آیا۔ مجھے یاد ہے کہ وہ عصر کا وقت تھا۔ نمبردار نے بتایا کہ وہ دائی کے خاوند کو ساتھ لایا ہے۔

"دائی تو شاید پاگل ہو گئی ہے ملک صاحب!" — نمبردار نے کہا — "بچے کی لاش پوسٹ مارٹم کے بعد گھر آئی۔ جب اسے نہلانے کا وقت آیا تو دائی بھی میت کو غسل دینے والی عورت کے ساتھ ہو گئی۔ عورتیں کہتی ہیں کہ میت سے کپڑا ہٹایا گیا تو دائی نے اتنی زور سے چیخ ماری کہ عورتوں کا اندر جو ہجوم تھا اُس پر سناٹا طاری ہو گیا۔ دائی نے اپنے مُنہ پر زور زور سے دو تھپڑ مارے اور چیخیں مارتی ہوئی باہر کو دوڑ پڑی۔ باہر جو آدمی بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے اُسے پکڑا لیکن اس نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ اُسے گھسیٹ کر اُس کے گھر لے گئے۔ اس پر چادر ڈالی کیونکہ اپنی قمیض پھاڑ کر وہ ننگی ہو گئی تھی۔ اُس نے چادر بھی پھاڑ ڈالی....

"شاہ صاحب کو بلایا۔ انہوں نے دیکھ کر کہا کہ یہ تو بڑا ظالم جن ہے۔ اس عورت نے اس جن کو ناراض کیا ہے۔ شاہ صاحب نے تعویذ لکھ کر دائی کے گلے میں ڈالا تو دائی نے تعویذ کا دھاگہ توڑ کر تعویذ دُور پھینک دیا۔ وہ چارپائی پر اُچھلتی اور چیخیں مارتی تھی۔ شاہ صاحب نے بہت جتن کئے لیکن دائی ہاتھ نہیں آتی تھی....

"رات ہو گئی۔ پنڈت عامل دائی کی یہ حالت سُن کر خود ہی اُس کے گھر چلا گیا۔ میں اُس وقت وہاں موجود نہیں تھا۔ دائی کے خاوند نے

مجھے بعد میں بتایا کہ جب پنڈت آیا اُس وقت دائی کچھ سکون میں آ گئی تھی۔ شاید اُسے نیند آ گئی تھی۔ پنڈت کو دیکھتے ہی وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔"

"اُس کے خاوند کو میرے پاس لاؤ" — میں نے نمبردار کا پورا بیان سُننے بغیر اُسے کہا۔

دائی کا خاوند آ گیا۔ میں نے اُسے بٹھا کر پوچھا کہ اُس کی بیوی کو کیا ہو گیا ہے۔ اُس نے اپنے رنگ میں بیان دیا جو تقریباً وہی تھا جو نمبردار دے چکا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ بتائے کہ جب پنڈت تمہارے گھر پہنچا تو تمہاری بیوی نے کیا کیا اور پنڈت نے کیا کیا۔

"اُس وقت میری بیوی آرام میں آ گئی تھی" — اُس نے کہا — "میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اب یہ ٹھیک ہو جائے گی لیکن پنڈت کو دیکھتے ہی وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ جناب اُس کی شکل بدل گئی۔ اُس نے اس طرح دانت نکال کر جیسے جس طرح کُتے لڑتے وقت دانت نکالتے اور غرّاتے ہیں۔ اُس نے اپنا دایاں بازو پنڈت کی طرف لمبا کیا جیسے ہاتھ اُس کے مُنہ میں دینے لگی ہو۔ اُس نے شہادت کی انگلی پنڈت کے مُنہ کے قریب کر کے غصّے سے کہا — 'کافر! تُو نے کیا کہا تھا اور کیا کیا ہے!'.... اُس نے اتنا ہی کہا تو میں نے دیکھا کہ اُس کا چہرہ بالکل صحیح ہو گیا۔ اُس کا مُنہ بند ہو گیا اور اُس کا بازو نیچے ہو گیا۔"

"اچھی طرح یاد کر کے بتاؤ" — میں نے اُسے کہا — "اُس وقت جب تمہاری بیوی کا چہرہ قدرتی حالت میں آ گیا تھا، کیا اُس وقت پنڈت اُس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا؟"

"ہاں جی!" — اُس نے جواب دیا — "یہ تو میں نے اچھی طرح دیکھا تھا۔ میں تو ڈر گیا تھا کہ میری بیوی کی اس بات پر پنڈت ناراض نہ ہو جائے لیکن پنڈت اُس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے پنڈت نے سُنا ہی نہیں کہ میری بیوی نے کچھ کہا ہے یا اُس نے کوئی نازیبا حرکت کی ہے۔"

رقم تھوڑی نہیں تھی۔ میں نے گنی۔ پورے دو ہزار تھی۔ اُن وقتوں میں جس کے پاس دو ہزار روپے ہوتے وہ بہت امیر کہلاتا تھا۔ داتی کے خاوند جیسا غریب آدمی اتنی بڑی رقم کو تصور میں بھی نہیں لا سکتا تھا۔

اُس کے اس بیان کے باوجود میں حیران تھا کہ اس شخص نے یہ مشکوک رقم نمبردار کو کیوں دکھائی اور پھر تھانے میں رقم لے آیا۔ کچھ دیر بعد جب میں نے اُسے فارغ کر کے باہر بھیجا تو نمبردار نے مجھے بتایا کہ اسے شک تھا کہ اس رقم کا تعلق بچے کے اغوا کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ دوسری وجہ یہ بھی کہ یہ شخص بہت سادہ تھا۔

میں نے اُسی وقت ایک ہیڈ کانسٹیبل کو بلا کر کہا کہ وہ واردات والے گاؤں جائے اور اس عامل پنڈت کو باہر بلائے۔ وہ جس حالت میں باہر آئے اُسے پکڑ کر ساتھ لے آئے۔ اُسے اپنے گھر میں داخل نہ ہونے دے۔ میں دراصل ڈرتا تھا کہ وہ اس بہانے اندر چلا جائے گا کہ تیار ہو کر آتا ہے اور اندر جا کر کوئی ایسا کالا عمل کر دے گا جس کے زیرِ اثر ہیڈ کانسٹیبل کی اور میری عقل بیکار ہو جائے گی۔ معلوم نہیں کہ کوئی ایسا عمل کیا جا سکتا تھا یا نہیں، میں اپنی بتاتا ہوں کہ میں ڈرتا تھا۔

نمبردار سے کہا کہ وہ گاؤں جائے اور کوشش کرے کہ داتی کو یہاں لے آئے۔ خواہ چارپائی کے ساتھ باندھ کر اور اُٹھا کر لانی پڑے۔

ایسا مکروہ چہرہ؟ ایسی لال آنکھیں؟

بڑا ہی عجیب کیس تھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا جب میرا اداردایتا مخبر شانو چوہدری افضل کے گاؤں سے اُس کے خاص آدمی جمی کو لے آیا۔ شانو اور ہیڈ کانسٹیبل نے میرے بتاتے ہوتے طریقے پر پوری

کامیابی سے عمل کیا تھا۔ راستے میں شانو اور جمی ہیڈ کانسٹیبل سے بار بار پوچھتے تھے کہ ان دونوں کو تھانے کیوں طلب کیا گیا ہے۔ ہیڈ کانسٹیبل شانو کو زیادہ ڈراتا اور بُرا بھلا کہتا تھا تا کہ جمی کو شک نہ ہو کہ شانو نے اُسے پکڑوایا ہے۔ افضل کو معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ جمی کو تھانے لے گئے ہیں۔

دونوں کو میرے سامنے لاتے۔ میں نے شانو سے کہا کہ تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کہ اس واردات میں تم ضرور شامل تھے۔ شانو ہاتھ جوڑ کر اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنے لگا۔ میں نے دونوں سے کہا کہ وہ اقبالِ جرم کر لیں یا ان میں جو بھی اس واردات میں شامل ہے وہ بول پڑے۔ میں اُسے وعدہ معاف گواہ بنا لوں گا۔ دونوں حیران و پریشان مجھ سے پوچھتے تھے کہ واردات کیا ہے۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ اس شانو کو حوالات میں بند کر دے۔ ہیڈ کانسٹیبل اُسے لے گیا۔ اس طرح جمی کی نظر میں شانو کی پوزیشن صاف ہو گئی۔ میں نے جمی کو اپنے سامنے کرسی پر بٹھا کر کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔

"غور سے سُن جمی!" ـــ میں نے کہا ـــ "میں نے تمہیں کسی شبہے میں نہیں بلایا۔ اپنے شک شبہے رفع کر کے تم پر ہاتھ ڈالا ہے۔ بولو کتنا جھوٹ بولو گے۔ تمہارے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔ جدھر مُنہ کرو گے اُدھر تمہارے خلاف ایک نہ ایک شہادت موجود ہو گی۔ سچ بولو اور مجھ سے فائدہ اُٹھاؤ.... پنڈت عامل کے ساتھ تمہارا کیا کام ہے؟"

"پنڈت سے؟" ـــ اُس نے حیران ہو کر پوچھا ـــ "اُس کے ساتھ میرا کیا کام ہو سکتا ہے؟"

میں کمرے میں ٹہلتے ہوئے اُس سے پوچھ رہا تھا۔ میں اُس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ اُس نے جب میرے سوال کا جواب دیا تو میں نے اُس کے دائیں کان پر پورے زور سے تھپڑ مارا۔ مجھے یقین ہے کہ اُس کا اس طرف والا کان عارضی طور پر بند ہو گیا ہو گا۔ میں نے اُسے وہ دن

یاد دلایا جس دن اور جس وقت اُسے شانو نے پنڈت کے گھر سے نکلتے دیکھا تھا۔ میں نے شانو کا نام نہ لیا۔

"اُس روز تم پنڈت کے گھر کیوں گئے تھے؟"

وہ بھی آخر اُستاد تھا۔ پہلے وہ حیران سا ہوا پھر مسکرایا۔

"سرکار!" — اُس نے کہا — "گھر کی بات تھی اس لئے میں دبا گیا تھا۔ پنڈت کے ساتھ میرا یہ کام تھا کہ میری بہن کو اُس کا خاوند بہت تنگ کرتا ہے۔ اُس کی ساس بڑی ہی شیطان عورت ہے۔ وہ اپنے بیٹے کو میری بہن کے خلاف بھڑکاتی رہتی ہے۔ مَیں تنگ آکر پنڈت کے پاس گیا اور اسے کہا کہ کچھ کرے۔"

"اور چوہدری افضل کو اولاد دلوانے کا کام بھی تمہارے سپرد تھا" — میں نے کہا۔

"نہیں سرکار!" — اُس نے کہا — "چوہدری افضل کے معاملے میں میرا کوئی عمل دخل نہیں۔"

"نہ سہی!" — میں نے کہا — "تمہیں یہ تو پتہ ہو گا کہ چوہدری افضل اولاد کے لئے اِس پنڈت سے ٹونے وغیرہ کروا رہا ہے۔"

"مجھے بھی پتہ ہے کہ چوہدری افضل اولاد کے لئے بہت پریشان رہتا ہے" — اُس نے کہا — "لیکن یہ پتہ نہیں کہ وہ اِس پنڈت کے پاس آتا ہے۔"

مَیں نے دروازہ کھول کر ایک ہیڈ کانسٹیبل کو بلایا اور اُسے کہا کہ وہ جمی کو ساتھ لے جائے اور اس کا ذرا دماغ درست کرے۔

ہندو عامل کا گاؤں ایک ہی میل دُور تھا۔ رات خاصی گزر گئی تھی۔ وہ بھی آگیا۔ اُسے لوگ ویسے ہی پنڈت کہتے تھے۔ وہ مذہبی پیشوا نہیں تھا یعنی کسی مندر کا پنڈت نہیں تھا۔ اگر وہ مندر کا پنڈت ہوتا تو اُس کے پیچھے پیچھے ہندوؤں کا ایک وفد آجاتا۔ اس عامل پنڈت کو میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اس قدر مکروہ چہرہ اور ایسی لال آنکھیں میں نے پہلے کبھی

نہیں دیکھی تھیں۔

اس کے چہرے کو مکروہ ہی ہونا چاہیئے تھا۔ قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے بتا رہا ہوں کہ کالا عمل یا کالا جادو کرنے والے عاملوں کے چہرے ایسے ہی مکروہ ہوا کرتے ہیں۔ اگر کراہیت نہ ہو اور چہرا اچھے نقش و نگار والا ہو تو بھی اسے دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ اتنا اچھا چہرہ ہونے کے باوجود یہ اچھا نہیں لگتا بلکہ اس سے مُنہ پھیر لینے کو جی چاہتا ہے۔ آپ کو اس چہرے پر نحوست کا احساس ہوتا ہے۔

چہرہ انسان کی فطری اچھائی یا بُرائی کا اظہار کرتا ہے۔ اگر انسان فطری طور پر نیک ہو اور اُس میں پیار اور محبت ہو تو اُس کے چہرے کے بھدے نقش و نگار بھی اچھے لگتے ہیں، اور اگر فطرت میں بدی، جھوٹ اور بنی نوع انسان کی دل آزاری کا جذبہ ہو تو نہایت پُرکشش چہرے بھی بھدے اور بھونڈے لگتے ہیں۔ کالا علم دوسروں کو نقصان پہنچانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی لئے اسے شیطانی یا سفلی عمل کہا جاتا ہے اور اسلام میں اسے گناہ قرار دیا گیا ہے۔

کالے علم میں دنیا کی دو شیطان قوموں نے شہرت پائی ہے۔ ایک یہودی دوسرے ہندو۔ یہودیوں کو اس شیطانی علم کا بانی کہا جاتا ہے۔ ان دونوں قوموں کا کردار دیکھ لیں۔ کمزور اور مجبور لوگوں کو قتل کر کے اور انہیں زندہ جلا کر خوش ہوتے ہیں۔ ان کے کردار کا بنیادی پتھر فریب کاری ہے۔ دوسروں کو نقصان پہنچانے کے لئے یہ دونوں قومیں اپنی بیٹیوں تک کو استعمال کرتی ہیں۔ جنسی گناہوں کو یہودی اور ہندو گناہ سمجھتے ہی نہیں۔

کالے علم کے عامل انسانی جذبات سے خالی ہوتے ہیں کیونکہ انہوں نے دوسروں کی تباہی کا سامان کرنا ہوتا ہے۔ میں نے اس پنڈت کے ساتھ اس موضوع پر بہت باتیں کی تھیں۔ اُس نے بتایا تھا کہ کالا جادو سیکھنے اور اسے کامیابی سے استعمال کرنے کے لئے شیطان فطرت ہونا لازمی

ہے۔ اس علم کے ذریعے کسی دوسرے کے گھر کو آگ لگائی جاتی ہے۔ انسانوں کو ایسی بیماری سے مارا جاتا ہے جسے ڈاکٹر بھی نہیں سمجھ سکتے۔ دوسروں کے کاروبار تباہ کئے جاتے ہیں۔ دوسروں کی شکلیں تک بگاڑ دی جاتی ہیں۔ آپ اکثر اخباروں میں پڑھتے ہیں کہ ایک گھر میں پتھر گرتے ہیں یا کپڑوں کو آگ لگ جاتی ہے یا اس گھر کا کوئی مسلسل نقصان ہوتا رہتا ہے۔ انہیں جنات کا کام کہا جاتا ہے لیکن یہ اس گھر کا کوئی دشمن کسی کالے عامل سے کالا عمل کروا رہا ہوتا ہے۔ میں آپ کو ایسی ایک تفتیشی کہانی کچھ عرصہ پہلے سنا چکا ہوں۔

کالے جادو کا عامل شیطان صفت اور درندہ ہوتا ہے۔ وہ انسانی جذبات سے اس قدر عاری ہوتا ہے کہ اپنے خون کے رشتوں کا بھی لحاظ نہیں کرتا۔ اپنے ماں باپ کا کام بھی منہ مانگے پیسے لئے بغیر نہیں کرتا۔ کالا عمل سیاہ چیزوں کے ذریعے چلایا جاتا ہے، مثلاً کالی مرغی جس کے پاؤں بھی کالے ہوتے ہیں۔ کالے بکرے کی سری، کالا کپڑا وغیرہ۔ یہ عمل سیاہ کالی رات میں کیا جاتا ہے۔ اگر یہ عمل کوئی عورت کسی کے خلاف کرائے تو اس عورت کے ساتھ کالے عامل کا جسمانی عیاشی کرنا لازمی ہوتا ہے کیونکہ اس عمل میں شیطان کو خوش کرنا ہوتا ہے۔ اگر آپ ایسے عامل کو کسی کے خلاف عمل کرتے ہوئے دیکھیں تو آپ کہیں گے کہ یہی وہ شیطان ہے جس نے اللہ کے حکم کی نافرمانی کرتے ہوئے آدم کے آگے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

یہ تو میں نے پہلے بھی سنا تھا، اس ہندو جادوگر نے تصدیق کی کہ کالے علم کا عامل گرمیوں میں بھی کئی کئی روز نہیں نہاتا۔ اُسے اپنا جسم بدبودار رکھنا پڑتا ہے۔ یہ تو میں نے اس پنڈت کو پاس بٹھا کر دیکھ لیا تھا۔ میں اُس کے جسم کی بدبو کو چار پانچ قدم دور سے بھی برداشت نہیں کر سکا تھا۔

اس کے مقابلے میں نوری علم کے عامل خود بھی پاک صاف رہتے ہیں اور جس سائل کو کوئی عمل بتاتے ہیں اُسے جسمانی لحاظ سے اور ذہنی

لحاظ سے بھی پاک صاف رہنے کی ہدایت سختی سے دیتے ہیں۔

یہ تو بڑا لمبا موضوع ہے۔ میں نے کالے علم کے عاملوں کی تفصیلیں اس لئے بیان کی ہیں کہ قارئین یہ نہ سمجھیں کہ کوئی انسان ایسا درندہ نہیں ہو سکتا کہ وہ نومولود بچے کو مار کر اُس کی دو پسلیاں اور دل نکال لے۔ کسی بھی کالے عامل کے لئے یہ کام ایسا ہی ہے جیسے آپ کسی پودے سے پھول توڑ لیتے ہیں۔

میرا مسئلہ یہ تھا کہ اس مکروہ انسان سے منوانا تھا کہ بچہ اس نے اغوا کرایا تھا اور چوہدری افضل کے کام کے لئے اغوا کرایا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ آج رات ہی تفتیش کو کسی نتیجے پر پہنچا دوں گا۔ پنڈت کو میرے سامنے بٹھا دیا گیا تھا۔

نفسیاتی عمل اور ردِّ عمل

"پنڈت جی مہاراج!"۔۔۔ میں نے پوچھا ۔۔۔"کیا چوہدری افضل کا کام ہو جائے گا؟ کیا اُس کی بیوی بچے کی ماں بن سکے گی؟"

"چوہدری افضل؟"۔۔۔ اُس نے حیران ہو کر کہا ۔۔۔"مجھے تو معلوم نہیں کہ کسی چوہدری افضل نے مجھے کوئی کام بتایا ہو"

"نہیں مہاراج!"۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔"آپ سمجھے نہیں۔ میں نے آپ کو تفتیش کے سلسلے میں نہیں بلایا۔ چوہدری افضل میرا دوست ہے۔ وہ مجھے سب کچھ بتا چکا ہے اور میں یہ کیس گول کر رہا ہوں۔ بات یہ ہے کہ میرا ایک چچازاد بھائی ہے۔ نو سال گزر گئے، وہ اولاد کو ترس رہا ہے۔ وہ بھی سب انسپکٹر ہے۔ آپ اُس کا کام کر دیں تو وہ آپ کو روپوں سے تول کر دولت دے گا۔ بہت رشوت لیتا ہے"

پنڈت کی عمر پینتالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ معلوم نہیں کس عمر میں اس کام میں پڑا ہو گا۔ مجھ جیسے کئی آدمیوں کو اُس نے انگلیوں پر نچایا ہو

گا۔ اُس نے تسلیم ہی نہ کیا کہ وہ بے اولاد عورتوں کو اولاد دینے کا کام کرتا ہے۔ مَیں اُس کے اور اپنے تمام مکالمے سُنا کر بات کو طول نہیں دینا چاہتا۔ مختصر بات یہ ہے کہ مَیں نے اپنی اُستادی کو پوری طرح استعمال کیا لیکن وہ بڑا ہی کایاں اُستاد نکلا۔ مَیں نے اُس کے ساتھ گپ شپ شروع کر دی تاکہ اُس کے ذہن سے یہ خطرہ نکل جائے کہ مَیں نے اُسے تفتیش کے سلسلے میں بلایا ہے۔ وہ مجھے کالے علم کی باتیں سناتا رہا۔

"پھر میرا ہی ایک کام کر دیں مہاراج!" — مَیں نے التجا کے لہجے میں کہا — "چوہدری شاہباز کے بچے کو اغوا اور قتل کرنے والے کا سراغ لگا دیں۔ میری عقل ساتھ چھوڑ گئی ہے۔ میری نوکری کا سوال ہے۔"

"یہ کام کر دوں گا" — اُس نے کہا اور آنکھیں بند کر کے خاموش ہو گیا۔ دو دفعہ اُس نے اپنے ہاتھ پر ہاتھ مارا جیسے تالی بجائی جاتی ہے، پھر آنکھیں کھول کر دیکھا — "پکڑا جائے گا .... آٹھ دن لگیں گے۔ دو میں سے ایک کام ہو گا۔ وہ خود آپ کے پاس آ جائے گا یا میں اُس کی ایسی نشانی بتا دوں گا جسے وہ چھپا نہیں سکے گا .... آٹھ دن .... آزما لیں۔ اگر مجھے اب جانے کی اجازت دیں تو میں آج ہی رات کام شروع کر دوں گا۔"

"چلے جانا مہاراج!" — میں نے کہا — "آپ اتنی اچھی باتیں کرتے ہیں کہ ساری رات آپ کے ساتھ گزارنے کو جی چاہتا ہے .... ہاں مہاراج! ایک اور کام یاد آ گیا ہے۔ پچھلے دنوں رہزنی کی معمولی سی ایک واردات ہو گئی تھی۔ جمیل عرف جمی کو میں نے شبہے میں پکڑا ہے۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ یہ اُس روز آپ کے پاس آیا تھا۔ اس کا آپ کے ساتھ کوئی کام ہو گا۔ آپ کے گاؤں سے واپس جاتے اُس نے راستے میں ایک آدمی کو چاقو دکھا کر اُس کی جیب سے پیسے نکال لئے۔ آپ اسے دیکھ کر پہچان لیں گے۔ کہہ دینا کہ یہ آپ کے گھر آیا تھا۔"

میں نے باہر جا کر کہا کہ جمی کو لے آؤ۔ وہ آیا تو میں نے اُسے پنڈت کے سامنے کیا۔

"یہی تھا پنڈت جی؟" — میں نے پوچھا۔

پنڈت ایسا چکرایا کہ اُس کے مُنہ سے ہاں نکل گئی۔ میں جمی کو ساتھ لے کر باہر نکل گیا اور کچھ وقت باہر ہی رہا۔

"اب بتا پنڈت!" — میں نے کمرے میں آ کر کہا۔ میں نے مہاراج جی اور پنڈت جی نہ کہا — "جمی نے تو ایک اور ہی راز کھول دیا ہے۔"

"کیا کہتا ہے؟"

"کہتا ہے بچے کو تم نے ہلاک کیا اور اس کی پسلیاں اور دل نکالا ہے" — میں نے کہا — "سچ اُگل دے پنڈت! تم بہت جھوٹ بول چکے ہو۔ دائی بھی آ رہی ہے۔ خود ہی بول۔ میرے ساتھ سودا کر اور اپنی جان بچا۔"

"کیسے آدمی ہیں آپ!" — اُس نے تحمل سے کہا — "ان چوروں اور اُٹھائی گیروں کی آپ مان رہے ہیں؟"

"میری بات کان کھول کر سُن!" — مَیں نے کہا — "یہاں تیرا کالا جادو نہیں چلے گا۔"

میں نے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو بلایا اور کہا کہ اب اس پنڈت کو لے جاؤ اور جمی کو یہاں لے آؤ۔ یہ یاد رکھیں کہ میں نے پہلے ہی بہت سے افراد کو مشتبہ بٹھا رکھا تھا۔ سب ابھی تھانے میں ہی تھے۔ ان میں چوہدری سکندر بھی تھا اور چوہدری شاہباز مقتول کی بیوی بھی تھی۔

"اب بتا جمی!" — وہ کمرے میں آیا تو میں نے اُسے کہا — "پنڈت نے سارا الزام تم پر اور چوہدری افضل پر تھوپ دیا ہے۔ کہتا ہے کہ میں نے تو انہیں صرف طریقہ بتایا تھا۔ مجھے تو معلوم ہی نہیں کہ اُنہوں نے بچہ کب اور کس طرح اُٹھایا ہے۔"

"جھوٹ بولتا ہے جناب!"

مجھے باہر شور شرابہ سُنائی دیا۔ دو تین چیخیں بھی سنائی دیں۔ میں تیزی سے باہر نکلا۔ دائی کو گاؤں سے لے آتے تھے۔ اس کی چارپائی

برآمدے میں رکھی جا رہی تھی۔ اُس کے اُوپر ربیوں کا جال تنا ہُوا تھا۔ میں اُس کے قریب گیا تو بناوٹی غصّے سے سب کو ڈانٹا اور کہا —— "کھولو اس بےچاری کو۔ تم جانتے نہیں ہو یہ میری بہن ہے؟" —— مَیں نے خود رسّیاں کھولنی شروع کر دیں اور اُسے لانے والوں کو بُرا بھلا کہتا رہا۔ مَیں نے دیکھا کہ دائی چپ ہو گئی تھی اور اُس نے نظریں میرے چہرے پر جما رکھی تھیں۔ میں نے بازو سے پکڑ کر کہا —— "آ میری بہن!" —— وہ بڑے آرام سے میرے کمرے میں آگئی۔

میں تفتیش کے لئے گاؤں گیا تھا تو اس دائی کو دیکھا تھا۔ اُس کا چہرہ صحت مند تھا اور اس پر جوانی کی رونق تھی۔ تین چار دنوں میں ہی اس کا چہرہ زرد پیلا اور بےنور ہو گیا تھا۔ اُس کے بال بکھرے ہُوئے تھے۔ وہ بالوں کو دونوں ہاتھوں سے نوچتی رہتی تھی۔ میں نے اُس کے لئے پانی منگوایا اور کہا کہ اس کے لئے دُودھ بھی لاؤ۔ میں اُسے کرسی پر بٹھا کر اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ یہ غالباً شفقت کا ہی اثر تھا کہ اُس کے چہرے پر سکون آنے لگا۔ میری شفقت کا اثر کچھ زیادہ ہی ہُوا ہو گا کیونکہ کسی تھانیدار سے شفقت کی توقع کوئی نہیں رکھا کرتا۔

"کیا ہو گیا ہے میری بہن کو؟" —— مَیں نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا —— "دل کھول کر بات کرو۔ یوں سمجھو تم اپنے سگے بھائی کے پاس آئی ہو۔"

میں نے اُسے اپنے ہاتھ سے پانی پلایا۔ اتنے میں دُودھ آ گیا۔ میں نے اُسے کہا کہ آرام آرام سے دودھ پی لے۔ آدھا دُودھ پی کر اُس نے میری طرف دیکھا اور لمبا سانس لیا جیسے اُس کے دل سے کوئی بوجھ اُتر گیا ہو۔

"تھانے میں آکر میرا دل ہلکا ہو گیا ہے" —— اس نے مری مری آواز میں کہا —— "ایک بات بتائیں۔ کیا آپ مجھے فوراً پھانسی دے دیں گے؟"

"کیوں؟" —— میں نے کہا —— "خواہ مخواہ اپنی بہن کو پھانسی دے دوں گا! .... تم بات کرو۔"

اُس کے آنسو بہنے لگے۔ آنسو دیکھ کر مجھے اطمینان ہو گیا کہ رونے سے اس کا غبار ہلکا ہو جائے گا۔

"نسیم کے بچے کو میں نے اُٹھا کر جمی کے حوالے کیا تھا" —— اُس نے کہا۔

"شاباش!" —— مَیں نے کہا —— "مجھے معلوم تھا کہ میری بہن جھوٹ نہیں بولے گی۔ اب دیکھنا، بھائی اپنی بہن کو پھانسی نہیں چڑھنے دے گا۔"

"انہوں نے میرے ساتھ دھوکہ کیا ہے" —— دائی نے کہا —— "کہتے تھے کہ بچہ ایک ٹُونے کے لئے چاہیئے اور دوسرے دن بچہ واپس کر دیں گے۔ انہوں نے بچے کی واپسی کا طریقہ یہ بتایا تھا کہ کھیتوں میں ایک جگہ بتائی تھی کہ بچے کو وہاں رکھ دیں گے۔ پولیس تک تو بات پہنچنی ہی تھی، لیکن میں نے اُدھر سے گزرتے اٹھا لانا اور سب کو یہ بتانا تھا کہ میں اُدھر سے گزر رہی تھی کہ فصل میں بچے کے رونے کی آواز آئی تو میں نے فصل میں جا کر دیکھا۔ وہاں یہ بچہ پڑا ہُوا تھا۔ یہ کسی کو بھی پتہ نہیں چل سکتا تھا کہ بچے کو کون لے گیا تھا اور فصل میں کیوں رکھ گیا تھا۔"

دائی نے اتنا ہی بیان دیا تو اُس نے ایک بار پھر سکون کی آہ بھری۔ میری حوصلہ افزائی اور شفقت شامل رہی۔ میں سوال بھی پوچھتا رہا۔ اس طرح دائی نے جو بیان دیا وہ مختصراً اس طرح ہے کہ چوہدری افضل کے گاؤں کی ایک عورت دائی کے پاس آئی تھی جو اپنے گاؤں کی دائی تھی۔ واردات والے گاؤں کی دائی اُس دائی سے بڑی اچھی طرح واقف تھی۔ اُس دائی نے اِس دائی کو اعتماد میں لے کر کہا کہ ایسے بچے کی ضرورت ہے جس کی پیدائش منگل کے دن کی ہو اور اُس کی عمر اکیس دن ہو جاتے۔ اُس نے کہا کہ اُس کے ہاتھوں منگل کے دن جو بچہ پیدا ہُوا تو اکیسویں دن وہ بچہ اُٹھا کر دے دے گی اور دو ہزار روپیہ نقد وصول کرے گی۔

ہمارے والی دائی دو ہزار روپے کے چکر میں آ گئی۔ ابھی نسیم کا بچہ پیدا نہیں ہُوا تھا۔ دائی نے معلوم کر لیا کہ بچہ چوہدری افضل کی بیوی کے لئے چاہیئے کیونکہ اُسے اولاد نہیں ہوتی اور بچے پر عمل پنڈت کرے گا۔ نسیم کا بچہ منگل کے روز پیدا ہُوا۔ نسیم نے پنڈت کو اُس کے گھر جا کر بتایا۔ پنڈت نے کہا کہ اکیسویں دن بچہ اُس تک پہنچ جانا چاہیئے۔ دائی نے اُس سے پوچھا کہ بچے کو جان سے تو نہیں مارا جائے گا؟ اُس نے یہ بھی کہا کہ بچے کی اگر جان لینی ہے تو وہ بچہ نہیں دے گی۔ پنڈت نے اُسے کہا کہ بچہ دوسرے روز زندہ واپس مل جائے گا۔

دائی کو جی سے بھی ملوایا گیا۔ نسیم نے یہ معمول بنا لیا تھا کہ بچے کو روزانہ دھوپ میں لٹا دیتی تھی۔ نسیم اور بچے کی بدقسمتی کہ اکیسویں روز گاؤں میں ماتم ہو گیا۔ چونکہ وہ دن بچے کی عمر کا اکیسواں دن تھا اس لئے جی صبح ہی پنڈت کے گھر آ گیا تھا۔ دائی نے اُسے جا کر بتایا کہ وہ آ کر نسیم کے دروازے پر دستک دے۔ دائی نسیم کے ہاں آئی۔ بچہ صحن میں سویا ہُوا تھا۔ دائی نسیم کو مالش وغیرہ کے لئے کمرے میں لے گئی۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ دائی کمرے سے نکلی۔ صحن سے بچے کو اُٹھایا۔ جی ڈیوڑھی میں آ گیا تھا۔ اُس نے اپنے اوپر کھیس ڈالا ہُوا تھا۔ دائی نے بچہ اُسے دیا۔ اُس نے بچہ کھیس میں چھپا لیا اور پنڈت کے حوالے کر کے چلا گیا۔

اُسی شام چوہدری افضل کے گاؤں کی دائی اس دائی کو دو ہزار روپیہ دے گئی۔

دائی چونکہ مجرمانہ ذہن کی عورت نہیں تھی اس لئے وہ بہت ڈری۔ رات کو سو بھی نہ سکی لیکن اس امید پر مطمئن ہو گئی کہ کل بچہ واپس مل جائے گا۔ وہ نسیم کو بچے کے لئے رونا اور تڑپتا دیکھتی تھی تو اُس کا دل ڈوبنے لگتا اور وہ اپنے آپ کو کوستی کہ اُس نے عورت ہو کر ایک عورت پر بہت بڑا ظلم کیا ہے۔

وہ پنڈت کے پاس گئی اور اُسے کہا کہ وہ بچہ اُس جگہ فصل میں رکھ آئے تاکہ وہ بچہ اُس کی ماں کے پاس لے جائے اور کہے کہ اسے بچہ

فلاں جگہ پڑا ملا ہے۔ پنڈت نے اُسے کہا کہ بچہ کل صبح ملے گا مگر ہُوا یہ کہ بچے کی لاش ملی۔ پوسٹمارٹم کے بعد لاش گھر آئی اور دائی نے دیکھی تو اُس پہ پاگل پن کی کیفیت طاری ہو گئی۔

دائی کو معلوم نہیں تھا کہ یہ پاگل پن ضمیر کا ردِعمل تھا اور اسے صرف اقبالِ جُرم سے تسکین مل سکتی تھی۔ وہ اس راز کو کہیں اُگلنے کو بے تاب تھی۔ یہ نفسیاتی معاملہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ تھانے میں آئی تو اسے سکون محسوس ہونے لگا۔ میں اتنی سی نفسیات سمجھتا تھا۔ چنانچہ میں دائی کے ساتھ شفقت سے پیش آیا تھا۔ دائی کو احساس ہو گیا تھا کہ یہ زہر اُگلنے کے لئے یہی جگہ ہے۔ یہ دراصل اُس کے ضمیر کی آواز تھی۔ فطری طور پر دائی شریف عورت تھی لیکن دو ہزار روپیہ اس غریب عورت کے لئے قارون کا خزانہ تھا۔ بہت دنوں بعد جب اُس کا ذہن نارمل حالت میں آ گیا تھا اور وہ پوری طرح پُرسکون ہو گئی تھی، اُس نے میرے ساتھ باتیں کرتے ہوئے کہا تھا کہ اُس کا ایک بیٹا اور دو بیٹیاں ہیں، بڑی بیٹی کی عمر تیرہ چودہ سال ہو گئی تھی۔ ایک تو وہ بیٹی کے لئے جہیز بنانا چاہتی تھی اور اُس کی سب سے بڑی خواہش بیٹے کو بہت زیادہ تعلیم دلانے کی تھی۔ اُس کے بیٹے کی عمر آٹھ سال تھی۔ اُس وقت وہ دوسری جماعت میں پڑھتا تھا۔

میں نے جب اس عورت کی باتیں سُنیں تو میں نے بہت سوچا کہ اسے وعدہ معاف گواہ بنا لوں۔ دو ہزار روپیہ تو اس کے ہاتھ سے نکل ہی گیا تھا، یہ سزا سے تو بچ جاتی لیکن یہ ممکن نہیں تھا کیونکہ بچہ اسی نے اُٹھا کر دوسرے ملزموں کو دیا تھا۔ اگر جرم میں اس کی اعانت معمولی نوعیت کی ہوئی تو میں اُسے وعدہ معاف گواہ بنا لیتا۔ ایسے گھناؤنے جُرم کے باوجود یہ غریب اور عام سی عورت مجھے اچھی لگ رہی تھی۔ اچھی تو اس لئے بھی لگ رہی تھی کہ اس نے اقبالِ جُرم کر کے میرا کام آسان کر دیا تھا۔

میں کہہ رہا تھا کہ دائی کا پاگل پن اور اس کا اقبالِ جرم نفسیاتی عمل اور ردِ عمل تھا جسے جناب میم الف صاحب اور نفسیات کے علم کو سمجھنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اسے ضمیر کا احتجاج اور ردِعمل کہہ لیں۔ میں نے پہلے بھی اپنی کہانیوں میں کہا ہے کہ قاتل اقبالِ جرم کر کے ہی سکون پاتا ہے۔

دائی پورا بیان دے چکی تو اُس کے چہرے پر رونق آ گئی۔ اُس نے پیٹھ کرسی کی پیٹھ کے ساتھ لگا کر مُنہ اوپر کیا اور لمبی سانس لی جیسے وہ بڑی لمبی اور کٹھن مسافت کے بعد منزل پر آ گئی ہو۔

میں نے اس کی موجودگی میں پنڈت کو بلایا۔ اُسے دیکھتے ہی دائی سیدھی ہو گئی۔ اُس کے چہرے پر کھچاؤ آ گیا اور اُس کے دانت آپس میں پسنے لگے۔

''نہ میری بہن!'' ___ میں نے کہا ___ ''اب اس کے ساتھ میں نمٹوں گا۔ یہاں اس کا جادو نہیں چل سکتا''۔

''اسے میرے سامنے پھانسی دو'' ___ دائی نے کہا ___ ''اس نے کہا کیا تھا اور کیا کیا ہے...... کافر! تو نے بچے کو چیر پھاڑ دیا ہے'' ___ اُس کی آواز بھرا گئی اور وہ رونے لگی۔

''بول پنڈت!'' ___ میں نے اُس کے قریب جا کر کہا۔

''کیا بولوں جی؟'' ___ اُس نے کہا۔

میں نے ایک بھرپور ہاتھ اُس کے مُنہ پر مارا۔ وہ دیوار سے جا لگا۔ میں نے دونوں ہاتھوں میں اُس کی گردن پکڑ کر اُسے اُوپر اُٹھایا اور فرش پر پٹخ دیا۔ اس ''سلام دعا'' کے بعد میں نے اُسے کہا کہ وہ اقبالی بیان دے۔ دائی کو میں نے ایک اور کمرے میں بٹھا دیا۔ زیادہ لمبی باتیں کیا سناؤں۔ میں نے جھوٹ بولا کہ جمی نے بھی اقبال جُرم کر لیا ہے اور چوہدری افضل آ رہا ہے۔

''اگر تم اقبالِ جرم نہیں کرو گے تو بھی سزا پاؤ گے'' ___ میں نے کہا ___ ''میں تمہیں سزائے موت دلاؤں گا۔ اگر تم خود اپنا جرم بیان کر دو گے تو میں تمہاری بچت کی صورت پیدا کر دوں گا۔ ایسی گنجائش رکھ دوں گا کہ اپیل میں بری ہو جاؤ گے''۔

ملزموں کو اقبال جرم تک لانے کیلئے جو ڈھنگ طریقے ہوتے ہیں وہ میں نے استعمال کئے۔ وہ اقبالِ جُرم پر راضی ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی اُس نے نقد رشوت پیش کی اور کہا کہ وہ مجھے ایک ایسی چیز دے گا کہ مجھے بہت جلدی ایس پی کے عہدے تک ترقی مل جائے گی اور میں جس عورت کی طرف دیکھ کر دل میں اُسکی خواہش پیدا کروں گا وہ بغیر بلائے میرے پاس پہنچ جائے گی۔

اُس وقت میری خواہش یہی ایک تھی کہ یہ مکروہ صورت پنڈت اقبالی بیان دے دے اور ایسی شہادت مہیا کر دے کہ میرا مقدمہ مضبوط ہو جائے۔

میں اُسے اُس مقام پر لے آیا جہاں اُس نے بولنا شروع کر دیا۔ وہ تو اس طرح بول رہا تھا جیسے عام سی کوئی بات سُنا رہا ہو لیکن مجھ جیسے سخت دل آدمی کی یہ حالت ہو رہی تھی جیسے رونگٹے کھڑے ہو رہے ہیں۔

جُرم یوں ہُوا

اس بھیانک جرم کا ارتکاب یوں ہُوا تھا کہ چوہدری افضل پنڈت کے پاس آیا اور بتایا کہ بچی بچہ نہیں ہوتا۔ پنڈت نے کہا کہ ہو جائے گا لیکن خرچ بہت ہوگا اور وہ چھ ہزار روپیہ لے گا۔ اس کیلئے ایک بچے کی ضرورت تھی جو منگل کے روز پیدا ہُوا ہو اور اکیسویں دن بچہ اُسے مل جائے جس پر وہ رات کو عمل کرے گا۔

چوہدری افضل نے ایک بچے کی خاطر زیادہ سے زیادہ روپیہ خرچ کرنے کی ہامی بھر لی۔ ایک روز افضل کا ایک آدمی جمی کھیس میں لپیٹ کر ایک بچہ لے آیا۔ جمی پہلے بھی اس کے پاس آ چکا تھا اور جس دن بچہ اُس کے پاس پہنچا اُس دن دائی بھی اُس کے گھر گئی تھی۔ اُس نے دائی کو بتایا تھا کہ وہ بچہ کل واپس کر دے گا۔ اُس نے واپسی کا طریقہ وہی بتایا جو دائی مجھے سنا چکی تھی۔ پنڈت نے مجھے بتایا کہ اُس نے دائی کے ساتھ جھوٹ بولا تھا۔

رات کو پنڈت نے بچے پر کچھ عمل پھر اُس کی ناک اور مُنہ پر اس طرح ہاتھ رکھ کر دبایا کہ بچے کا سانس رُک گیا اور وہ تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ پنڈت نے تیز دھار چاقو سے بچے کی بائیں طرف سب سے نیچے والی پسلی کے قریب سے کاٹا اور بچے کا دل باہر کھینچ کر چاقو سے الگ کر لیا۔ پھر اُس نے بچے کی دونوں طرف کی پسلیاں گِن گِن کر دونوں طرف سے درمیان والی ایک ایک پسلی کاٹ لی۔ دل اور پسلیوں پر بھی اُس نے کچھ پڑھا اور نہ جانے کیا کچھ کیا۔ اُس رات اُس نے جمی کو بلا رکھا تھا اور اُسے کہا تھا کہ وہ کدال ساتھ لائے۔

جمی رات دو بجے تک اُس کی ڈیوڑھی میں بیٹھا رہا۔ آخر پنڈت نے اُسے بچے کی لاش دے کر کہا کہ اسے کسی ویرانے میں دفن کر دے۔ پھر اُسے کہا کہ وہ

اگلے روز کسی بھی وقت پنڈت کے پاس آئے۔ پنڈت کو معلوم نہیں تھا کہ جمی نے لاش کہاں دفن کی تھی۔ جمی دوسرے دن پنڈت کے گھر آیا۔ پنڈت نے بچے کا دل کالے کپڑے میں لپیٹ کر رکھا ہُوا تھا۔ یہ جمی کو دے کر کہا کہ کپڑا کھول کر کوئی نہ دیکھے اور اسے افضل کی بیوی اپنے ہاتھ سے اپنے صحن میں کسی جگہ پانچ چھ انچ کی گہرائی میں دبا دے۔

میرے پوچھنے پر پنڈت نے بتایا کہ چوہدری افضل اُس کے پاس صرف دو بار آیا تھا وہ بھی رات کے وقت۔ پہلی بار اپنی حاجت بیان کرنے اور دوسری بار ساڑھے چھ ہزار روپیہ دینے آیا تھا۔

''اور بچے کی پسلیاں؟''

''وہ میرے گھر میں ہیں'' ___ پنڈت نے جواب دیا ___ ''اِن پر پورے اکیس راتیں عمل پورا کرنا ہے''۔

''کیا یہ عمل پورا ہو جانے سے افضل کے گھر بچہ ہو جانا تھا؟'' ___ میں نے پوچھا۔

''ہاں!'' ___ اُس نے جواب دیا ___ ''بچہ ضرور پیدا ہوتا لیکن اس بچے نے ذہنی یا جسمانی طور پر صحیح نہیں ہونا تھا۔ اس بچے نے بڑے ہو کر اپنے باپ کو یا ماں کو قتل کر دینا تھا''۔

بیان کے آخر میں اُس نے بتایا کہ دائی پر جب پاگل پن کا دورہ پڑا تو گاؤں میں شور مچ گیا کہ دائی پاگل ہوگئی ہے۔ پنڈت اِس ڈر سے اُس کے گھر جا پہنچا کہ دائی یہ جرم بے نقاب نہ کر دے۔ پنڈت نے اُسے ہپناٹائز کر لیا تھا لیکن یہ اثر زیادہ دیر قائم نہ رہا۔

میں نے پنڈت کو ساتھ لیا۔ نمبردار، ایک ہیڈ کانسٹیبل اور تین کانسٹیبل بھی ساتھ تھے۔ پنڈت کو ہتھکڑی لگائی تھی۔ میں اس پارٹی کو یکے میں بٹھا کر اُس کے گاؤں گیا۔ ایک مسلمان اور ایک سکھ کو ساتھ لے کر پنڈت کے گھر میں داخل ہوا۔ اُن کے سامنے اُسے کہا کہ جس چاقو سے اُس نے بچے کا پیٹ اور سینہ کاٹا تھا وہ چاقو اور بچے کی دونوں پسلیاں میرے حوالے کر دے۔

اُس نے چاقو اور پسلیاں ان گواہوں (مشیروں) کے سامنے مجھے دے دیں۔

اُس کے اِس خاص کمرے میں ایسی بدبُو تھی جیسے میں بیت الخلاء میں کھڑا ہوں۔

''اب وہ ساڑھے چھ ہزار روپیہ بھی میرے حوالے کر دو جو تم نے فلاں گاؤں کے چوہدری افضل سے لیا تھا'' ___ میں نے کہا۔

''وہ تو میری محنت کی اُجرت ہے حضور؟'' ___ اُس نے کہا ___ ''یہ رقم نہ لیں۔ یہ میرے بچوں کے کام آئے گی''۔

میں نے اُس سے یہ رقم نکلوائی اور مشیروں کے سامنے اُس سے کہلوایا کہ اُس نے یہ رقم چوہدری افضل سے وصول کی تھی اور جس مقصد کے لئے رقم لی تھی وہ بھی کہلوایا۔ دونوں مشیروں نے بے اختیار اپنے کانوں کو ہاتھ لگائے اور توبہ توبہ کرنے لگے۔ میں نے برآمدگی کا مشیر نامہ تحریر کیا اور پنڈت کے اور دونوں مشیروں کے اِس پر دستخط کرائے۔

وہاں سے میں اپنی پارٹی اور پنڈت کو ساتھ لے کر اسی یکے پر افضل کے گاؤں چلا گیا۔ وہ گھر ہی تھا۔ اُس کا چوبارہ شاندار تھا۔ مجھے اور پنڈت کو دیکھ کر اُس کا رنگ لاش کی طرح ہو گیا۔ میں اُسے اندر لے گیا اور کہا کہ میں نے اس کی بیوی سے بچے کا دل برآمد کرانا ہے جو صحن میں دبایا ہُوا ہے۔ اس نے میرے آگے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ میں اپنے مُنہ سے بولوں کہ کتنی رقم چاہتا ہوں، وہ اُسی وقت حاضر کر دے گا۔ میں صرف یہ لکھ دوں کہ اس گھر سے کچھ بھی برآمد نہیں ہُوا۔

میں باہر نکلا۔ اس گاؤں کا نمبردار آ گیا تھا۔ اُسے کہا کہ وہ دو ذرا پڑھے لکھے آدمی ساتھ لے آئے۔ وہاں آدمیوں کی کمی نہیں تھی۔ پنڈت کو ہتھکڑیوں میں اور پولیس کو دیکھ کر سارے گاؤں کی آبادی اکٹھی ہوگئی تھی۔ دو آدمی میرے پاس آ گئے۔ میں افضل کے گھر کے اندر چلا گیا۔ اُس کی بیوی کو دیکھا۔ جوان اور خوبصورت عورت تھی۔ میں نے اُسے کہا کہ کالے کپڑے میں لپٹا ہُوا بچے کا دل صحن میں جہاں دفن کیا تھا وہ جگہ دکھا دو۔

دو مشیر ساتھ تھے۔ عورت نے اپنے خاوند کی طرف دیکھا۔

''اگر انکار کرو گے تو میں باہر سے آدمی لا کر سارا صحن کُھدوا ڈالوں گا'' ___ میں نے کہا ___ ''خود ہی بتا دو''۔

افضل ایک طرف چل پڑا۔ صحن کچا تھا۔ افضل نے ایک جگہ پاؤں رکھا اور

میری طرف دیکھا۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ خود یہ جگہ کھود کر دل نکالے اور میرے حوالے کرے۔ اُس نے لوہے کا ایک ٹکڑا اُٹھایا اور وہ جگہ کھود کر کالے کپڑے میں لپٹا ہُوا دل میرے حوالے کر دیا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ اس میں کیا ہے؟

''جو آپ کہتے ہیں'' ___ اُس نے جواب دیا۔

''تم اپنی زبان سے کہو'' ___ میں نے رعب سے کہا۔

''بچے کا دل ہے'' ___ اُس نے جواب دیا۔

''یہ یہاں کس نے دبایا تھا؟''

''میں نے!'' ___ اُس نے جواب دیا۔

''تمہاری بیوی نے!'' ___ میں نے کہا۔

''جناب ملک صاحب!'' ___ اُس نے کہا ___ ''میری بیوی کو کچھ پتہ نہیں۔ جو الزام ہے وہ میرا ہے۔ جواب مجھ سے لیں''۔

وہ جھوٹ بول رہا تھا لیکن میں نے اُس کے جھوٹ کو اس وجہ سے قبول کر لیا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو بچانا چاہتا تھا۔ میں بھی مسلمان تھا اور میں اسی معاشرے کا فرد تھا۔ مجھ میں بھی غیرت تھی۔ اگر اُس کی بیوی دل برآمد کراتی اور کہتی کہ یہ اُس نے دبایا تھا تو پانچ چھ سال سزائے قید پاتی۔ تھانے جا کر افضل نے مجھے کہا تھا کہ میں اُس کی بیوی کا نام گواہوں میں بھی نہ آنے دوں۔ اس کی اُس نے رشوت پیش کی تھی۔ میں نے اُسے کہا تھا کہ میں بے غیرت نہیں ہوں۔ اُس کی عزت کو اپنی عزت سمجھتا ہوں بشرطیکہ وہ اقبال بیان دے دے۔

اُس نے بیان دے دیا۔ میں نے یہ ظاہر کیا کہ افضل کی بیوی کو اس جرم کا علم نہیں ہے۔ جمی نے بھی بیان دے دیا۔

میں نے بڑی محنت سے مقدمہ تیار کیا۔ پنڈت کو سزائے موت دی گئی۔ جمی کو عمر قید، چوہدری افضل کو دس سال اور دائی کو آٹھ سال سزائے قید دی گئی۔ ان سب کی اپیلیں ہائی کورٹ نے مسترد کر دیں۔ ہائی کورٹ نے سیشن جج کا یہ فیصلہ بھی بحال رکھا کہ پنڈت سے جو ساڑھے چھ ہزار روپیہ اور دائی سے دو ہزار روپیہ اور جمی سے ڈیڑھ ہزار روپیہ برآمد ہُوا تھا، یہ تمام رقم مقتول بچے کی ماں نسیم کو دے دی جائے۔